آرٹ : عادل منصوری

جلد : ۱۳ شمارہ : ۵۰ اپریل تا جون ۲۰۰۸

مدیر : محمود واجد

مشیر ادبی : سائرہ غلام نبی مشیر انتظامی : ممتاز ہاشمی

آرٹ ورک : عادل منصوری

کمپوزنگ : محمد علی عطاری 0300-2696830

ٹیرف (پاکستان)

عام شمارہ : ۸۰ روپے

صفحات : ۱۶۰

قیمت (سالانہ) : ۳۰۰ روپے

(مع ڈاک خرچ)

دیگر ممالک (سالانہ)

بھارت/ بنگلہ دیش : ۴۰۰ روپے

سعودی عرب/ امارات : ۱۲۰ ریال/ درہم

یورپ/ امریکہ : ۲۰ پاؤنڈ/ ۳۰ ڈالر

(مع ڈاک خرچ)

جلد : ۱۳ شمارہ : ۵۰ اپریل تا جون ۲۰۰۸

رابطہ کے لیے

ہاشمی ٹریڈنگ، ۳۔اقبال منزل، کیمبل روڈ، (نزد برنس روڈ)، کراچی ۷۴۲۰۰

تیز تر رابطہ

دفتر : 2624040-2626516

رہائش : 4640468-4655711

موبائل : 0300-2244866

تہذیب

صفحہ	عنوان	تحریر	

قطعات

فِکشن

غزلیں

دوہے

اور زبانوں کا ادب

مطالعے اور جائزے

محبتیں اور شکایتیں

اَب ہم کہاں آ گئے ہیں؟

کبھی کبھی ہمیں خیال آتا ہے کہ ہم نے اپنی مجوّزہ منزل کی کوئی جھلک دیکھی بھی ہے یا یوں ہی بَس چلے جا رہے ہیں کہ کہیں تو پہنچیں گے۔ اُداسی کا ایک سمندر اُمنڈتا ہوا ہمیں گہرے پانیوں میں لے جاتا ہے۔ تخلیق و تعمیر، تعبیر و توجیح کیا ایسے ہی مشکل کام ہیں۔ علم و ادب کے ہم مدعی تو ہوتے ہیں لیکن معروضی صورتِ حال میں ہم اپنے حواس کیوں کھونے لگتے ہیں۔ بڑی ردوکد کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ ہمارا چلنا مشروط ہے کئی اور چیزوں سے بھی۔ منزل کا ادراک ارادے کی پختگی، زادِ راہ کی موجودگی اور ممکنہ سچائیوں سے اپنی رغبت کا احساس!

ہمارے سفر کو ایک "جگ بیتا۔ ہمیں احساس ہے کہ ہم جہاں سے چلے تھے وہاں سے کافی آگے نکل گئے ہیں۔ نشانِ راہ چھوڑتے آئے ہیں کہ بعد میں آنے والوں کی منزلیں آسان ہوں۔ ہماری اپنی محدودات شاید ہمارا مقدر تھیں لیکن قدرت نے ہمیں جو کچھ دیا تھا اس کو آگے لے جانا میری اپنی ترجیح تھی۔ سو نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ کوئی معذرت، کوئی محرومی، کوئی شکستگی سدِ راہ نہیں۔ ہم رواں دواں ہیں۔ تازہ دم تو نہیں کہوں گا کہ یہ ہماری معروضی صورتِ حال میں دوسروں کا حق ہے۔

نئی نسل جو تازہ دم ہو، کچھ کر گزرنے کا حوصلہ رکھتی ہو اور کُھلی فضا میں سانس لے رہی ہو۔ کسی طور سے مشروط نہ ہو اُسے آگے آنا چاہیے۔ آیئے دیکھیں کون آتا ہے۔ اس کے تیور کیا ہیں اس کی اپنی ترجیحات کا سلسلۂ نسب کہاں جا کر ملتا ہے۔ ہمیں تو ہمیشہ نئی صبح کی نوید کا احساس چاہیے۔ اور بَس!

(محمود واجد)

محمود واجد

دوسرا صفحہ

ہر صبح ایک نئی تازگی لیے طلوع ہو رہی ہے اور ہر نیا لمحہ، نئے منظر، نیا ماحول، نئی کیفیت کی تشکیل کر رہا ہے۔ معاصر عالمی صورتِ حال میں عصری، سیاسی، معاشی اور ثقافتی تبدیلیاں پل پل ہو رہی ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی اپنے ساتھ محض مشینیں ہی نہیں، نئی طرزِ فکر بھی ساتھ لا رہی ہیں۔

تبدیلیوں کی زد میں آیا ہوا، ہمارا سماجی نظام جو عالمی اور مشترک ہونے کا دعوے دار ہے اپنے اندر بہت سے سوالات بھی لا رہا ہے۔ مگر ادیب! جو زندگی کا مطالعہ جتنے غور سے کرتا ہے۔ اس کا Content بھی اتنا ہی درست ہوتا ہے۔ وہ اس نئے فکری نظام سے انسلاک پر اپنے تجربہ کا ارتکاز بھی کر رہا ہے۔

یوں بھی ہر لکھنے والا اپنا تخلیقی تجربہ انفرادی حیثیت میں پیش کرتا ہے۔ وہ آزادانہ طرزِ فکر اور اپنی دنیا آپ بسانے کا آرزومند، نئی زندگی، نئے تجربے کا خواہش مند بھی ہوتا ہے اس کا اظہار تخلیقی فن پاروں میں نظر آتا ہے۔ لیکن یہ بھی دیکھتے ہیں کہ آج کے منظر نامے میں آج کا ادیب جسے خود اعتماد ہونا چاہیے وہ کئی صورتوں میں اب بھی فرسودہ روایتوں سے جڑا نظر آتا ہے۔ وہ بہتر شاعر، بہتر مصنف اور بہتر نقاد ہونے کے باوجود اپنی آزاد ذہنی کو کسی نہ کسی گروپ، گروہ، فورم یا انجمن کے تابع کر دیتا ہے۔ ادبی رفاقتیں عملاً اسے ادب سے دور اور ادیب سے قریب ضرور کر دیتی ہیں پھر یہاں وہ سچائی کا عوضانہ ادا کرتا رہ جاتا ہے۔ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کہنے کی اجتماعی سوچ کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہے۔ کیا یہ گروہ بندیاں تخلیقی وفور پر قدغن نہیں لگاتیں، کیا آپ کی اپنی صلاحیتیں صحت مندانہ مقابلے کی بجائے مریضانہ سوچ کی مظہر نہیں ہوتی چلی جاتیں۔ میں اس پہلو پر بہت سوچتی ہوں۔ کیا آپ کے ذہن میں بھی کوئی ایسی خلش ہے؟ آیئے ارتکاز کریں!

(سائرہ غلام نبی)

حمدیہ:۱

ادیب سہیل

خدا ہے اک داخلی حقیقت
قیام کرنا ہے دل میں
اور ظاہری آنکھ کی رسائی محال جس تک
وہ حسن محسوس ہے
اسی رہ گزر میں قرب جمال ہوگا

خدا ہے اک داخلی حقیقت
اور اس حقیقت کا، آدمی، شکل خارجی ہے
ہو جب بھی مطلوب اس کو اپنا مشاہدہ تو
اسی دریچے سے جلوہ کرتا ہے
آدمی ممکنات کی حد آخری تک مراجعت کا ازل
سے طالب
یہ حد ورائے ورا ہے
یہ خلوتِ خدا ہے!

❁❁

حمدیہ:۲

ادیب سہیل

لا اور اِلّا
خدا کے افہام کے یہ دو راستے ہیں جن پر
ازل سے انسان گامزن ہے
سفر میں اِلّا کے ہے، جو رستہ
بندھا ٹکا ہے
سفر میں لا کے ہر اک قدم امتحاں کڑا ہے
پہاڑ، وادی، ڈھلان، جنگل
اسی کے سارے یہ پیچ در پیچ سلسلے ہیں
حرا تشکک کا ہے یہاں......اور
اس کے حجلے میں جگنوؤں کی چمک دمک ہے
سفر یہ منصور طبع لوگوں کو ہر زمانے میں راس آیا
خدا کی تفہیم کے سفر میں یہ ٹیڑھے رستے کی
آبرو ہیں!

❁❁

Address:
E-9, Erum Villa, Block 14
Gulshan-e-Iqbal Karaci : 75300
Ph # 4931026

شخصِ محترم ﷺ

ادیب سہیل

(نعتیہ)

خلا کی تسخیر نے کئی اور در کو ذہنوں میں
وا کیے ہیں
''زمین سب کچھ ہے'' کے تصوّر میں ایک رخنہ
سا پڑ گیا ہے
نگاہ ہے اور شواہد
یہ چاند، تارے
فلک، سیارے
نئے جہاں کی بشارتوں کے ہیں پیش خیمہ
اور آدمی اس کا حیرتی ہے
وہ پھیل کر کائنات بننے کے خواب سے بھی
ہوا ہے خائف
وہ بے یقینی کے دائرے میں سمٹ رہا ہے
وہ کتنے نادیدہ اور مفروضہ دہشتوں میں
گھرا ہوا ہے
شعورِ نامعتبر کے نرغے میں سانس لیتا ہے
سہم ناکی میں جی رہا ہے
اُس آدمی کو کوئی بتائے
ترا علاقہ ہے جس قبیلے سے
اس قبیلے میں وہ بھی ایک شخصِ محترم تھا

زمیں سے افلاک کے سفر میں
جو اُن مقامات سے بھی گزرا
جہاں رسائی سے پر فرشتوں کے جل اُٹھے تھے
وہ معتبر شخص ﷺ
زمیں سے افلاک کے سفر میں بھی آدمی تھا
فلک سے روئے زمیں پہ جب لوٹ کر بھی آیا
تو آدمی تھا
وہ شخصِ معراجِ آدمی تھا
اَبد اَبد تک یہ کائنات اس کے سب مظاہر
تصرفِ آدمی کی خاطر پرے جمائے
کھڑے رہیں گے

❁❁

Address:
E-9, Erum Villa, Block-14
Gulshan-e- Iqbal Karachi : 75300
Ph # 4931026

گوئٹے کی خودنوشت سوانح حیات: ایک مطالعہ

ناصر بغدادی

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ضعف و ضعیفی سے دوچار ہو جانے کے بعد گوئٹے کی رومان و وجدان سے عبارت شعری محرکات کے مقابلے میں سچائی سے مشتق احساسات زیادہ فعال و متحرک ہو گئے تھے۔ یہ عین ممکن تھا کہ گرتی ہوئی صحت کی بناء پر گوئٹے کے اندرون رومانیت کی وہ چاشنی نسبتاً کم ہو گئی تھی جس کی لذت جوانی میں کام و دہن سے گزر کر اس کی ذات کا ایک ناگزیر حصہ بن چکی تھی۔ لیکن جس سچائی کو وہ جوانی میں بھی زندگی کا لازمی جزو سمجھتا تھا اب وہ ڈگمگاتی زندگی کے اس انحطاط پذیر دور میں ایک تنومند کائناتی استعارہ بن کر اس کی رُوح سے ہم آغوش ہو گئی تھی۔ شاعری اور صداقت کا ایک اچھوتا باہمی تفاعل گوئٹے کی خودنوشت سوانح میں ایک منفرد پیرایہ اظہار کے ساتھ قارئین کے سامنے آتا ہے۔ گوئٹے اپنے بچپن اور جوانی میں جن یادگار زندہ کرداروں کے مابین یادگ.. .عات کو جنم لیتے ہوئے دیکھتا رہا تھا، ان کو وہ یوں تازہ کارانداز میں ہماری نظروں کے سامنے سے گزارتا ہے جیسے ان کا ہماری زندگیوں سے بھی بڑا قریبی تعلق رہا ہو۔ ''شاعری اور صداقت میری اپنی زندگی سے۔'' (Poetry & truth from my own life) گوئٹے کی خودنوشت سوانح کا عنوان ہے جس کو تھامس مان نے عالمی ادب کی چند بہترین سوانح عمریوں میں شمار کیا ہے۔ مان (Mann) کے نزدیک یہ آپ بیتی واحد متکلم میں ایک ایسے دلچسپ اور دل پذیر ناول سے کسی طرح کم نہیں جس کے مطالعے سے قاری کو معلوم ہوتا ہے کہ ایک نابغۂ روزگار کس طرح ارتقاء اور نمو پذیری کے دشوار گزار مراحل سے گزرتا ہے۔ اس کے بقول اس آپ بیتی کا مطالعہ اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہم شخصیات خودرو گھاس کی مانند پیدا نہیں ہوتیں، اور وہ ان نامساعد حالات میں بھی زندگی کے مثبت اقدار کا علم اُٹھا کر وہ کچھ کر گزرتی ہیں جن میں دوسرے عام افراد آسانی سے نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو سکتے ہیں۔

گوئٹے نے جب اپنی خودنوشت سوانح کے بنیادی خاکے (Blue Print) پر ۱۸۰۹ء میں کام شروع کیا تھا تو اس وقت اس کی عمر ساٹھ برس کی ہو چکی تھی، اور اس کو ادب کے عالمی حلقوں میں اپنے باوقار ادبی کارناموں کی وجہ سے شہرت اور نام وری کی کبھی ختم نہ ہونے والی دولت حاصل ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ اب وہ ایک ایسا سرد و گرم زمانہ چشیدہ انسان ہو چکا تھا جس کو زندگی کے تغیرات، تجربات اور وقت کے بدلتے ہوئے انقلابات سے خوب آگاہی حاصل ہو چکی تھی۔ اس خودنوشت پر گوئٹے تقریباً اکتیس برسوں تک کام کرتا رہا، اور اپنی موت سے ایک سال قبل اس نے ۱۸۳۱ء میں اپنی خودنوشت کو مکمل کیا تو اس کو بے مثل پذیرائی تو حاصل ہوئی لیکن یہ ایک

حیرت زا بات ہے کہ اس میں گوئٹے کی زندگی کے وسیع تر کینوس پر پھیلے ہوئے بہت سے بوقلموں تجربات وحوادث کو جگہ نہ مل سکی تھی۔ اگرچہ گوئٹے کی خودگزشت تین حصوں اور بیس ابواب (جن کو اس نے کتب کا نام دیا ہے) پر مشتمل ہے مگر اتنے طویل عرصے کی محنت بسیار کے باوجود، صرف اپنی پیدائش سے ۱۷۷۵ء تک کا چھبیس برسوں کا وقفہ مکمل کر سکا تھا۔ اس سوانح حیات کا متجسس قاری شاید گوئٹے کی اس انہونی منطق کو کبھی نہ سمجھ سکے کہ آخر اس نے کن وجوہ کی بناء پر ۱۷۷۵ء سے ۱۸۳۱ء (جب یہ آپ بیتی مکمل ہوئی تھی) تک کے طویل ادبی اور ذاتی حوالوں پر مشتمل بے حد اہم وقفے کو قلمبند کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس سوانح حیات کا کوئی قاری یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ گوئٹے نے یہ سب کچھ دانستہ طور پر کیا تھا، یا زندگی نے اسے مہلت نہیں دی تھی۔ ایک اور سوال جو اس سوانح حیات کے قاری کے ذہن میں جنم لے سکتا ہے وہ یہ کہ کیا زندگی کے پہلے چھبیس برسوں کا ناسٹلجیائی (Nostalgic) عرصہ گوئٹے کے نزدیک اس کے مابعد چھپن یا ستاون برسوں کے پختہ کار تجربات کے مقابلے میں زیادہ اہم تھا یا ایسا سب کچھ اس نے ارادتاً کہا تھا؟

یہ کتاب محض گوئٹے کی یادداشتوں کا ایک مجموعہ ہی نہیں بلکہ اس کے مطالعے سے ہم اس عظیم شاعر کی زندگی کے ایسے مختلف النوع گوشوں کو اپنے گوشۂ چشم میں سمیٹ سکتے ہیں جن کے متعلق شاید ہم نے کبھی بھول کر بھی نہیں سوچا ہو۔ گوئٹے نے کرۂ ارض پر قدم رکھنے کے بعد اپنے بچپن، لڑکپن اور جوانی میں جن اہم شخصیات کو قریب سے دیکھا تھا اور جنہوں نے اس کی زندگی کو متاثر کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا، اور جن کے حوالے سے اس کی زندگی میں یادگار واقعات جنم لیتے رہے تھے، ان کو اس خودنوشت نگار نے بڑے مؤثر انداز میں رقم کیا ہے۔ فی الاصل گوئٹے کی یہ آپ بیتی اس کے عہد کا منظر نامہ ہے کہ اس کے مطالعے سے ہم اپنے آپ کو اس کے عہد میں سانس لیتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ہمارے سامنے، ضعیف العمر گوئٹے آتش دان کے قریب بیٹھا، اپنے آپ کو بڑی مشکل سے قابو میں رکھتے ہوئے، گزرے ہوئے دنوں کی یادوں کو ہمارے گوش گزار کر رہا ہو۔ اور پھر جیسے اس سوانح حیات کے بچھڑے ہوئے کردار ایک خاص جذباتی انداز میں کمرے میں داخل ہو گئے ہوں، اور یکے بعد دیگرے اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بوڑھے گوئٹے سے معانقہ کرنے میں مصروف ہو گئے ہوں۔ دُکھ سکھ اور رنگا رنگ یادوں پر مبنی یہ سوانح حیات اسٹیج کے ایک ایسے ڈرامے سے مختلف نہیں جہاں پسِ منظر میں یادوں کے ڈھیر پر بیٹھا کوئی شخص اپنی زندگی کے واقعات ڈرامائی انداز میں دہرا رہا ہو، اور پھر جیسے اچانک اس کی زندگی کے حقیقی شریک کار وہ تمام اہم کردار اسٹیج پر پہنچ کر اپنے ماضی کے اس پارٹ کو دہرانے میں مصروف ہو گئے ہوں جس کا اساسی تعلق ان کی زندگیوں میں پسِ منظر کے قصہ گو سے رہا تھا۔

گوئٹے نے مذکورہ خودنوشت سوانح کے پہلے حصے میں اپنے آپ کو بطور ''ایک لڑکا'' پیش کیا ہے۔ اس کا زمانہ طفلی اس کے ذہن کی زنبیل کو یادوں کے انمول جواہرات سے بھر دیتا ہے۔ اس یادگار دور کے واقعات کا تذکرہ

کرتے ہوئے اس کے احساسات میں مدوجزر کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نے اپنے بچپن کا ایک معتد بہ حصہ اپنی دادی کے گھر میں گزارا تھا جو فرینک فرٹ (Fran Furt) کے ایک خوب صورت مقام پر واقع تھا۔ اس عہد کے حوالے سے گوئٹے اپنے قارئین کو بہت سی ایسی باتیں بھی بتاتا ہے جن کی بابت شاید دوسرے خودنوشت سوانح نگار ایک ناختتم خاموشی کو ترجیح دیتے۔ جب وہ اپنے بچپن کی معصومیت سے مملو باتوں کو ہمارے گوش گزار کرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی مسافر اندھے راستوں پر چلتے ہوئے پیچھے مڑ کر ان چہروں کو تلاش کر رہا ہے جن کو وقت کی دھند نے اپنی آغوش میں لے لیا ہو۔ اور پھر جیسے اچانک دھند میں سے بہت سے کردار یکے بعد دیگرے نمودار ہوتے جا رہے ہوں۔ گوئٹے اپنے اس زرّیں عہد میں اپنے خاندان کے بہت سے افراد سے بے حد متاثر رہا تھا اور اس کے شعور کو بلوغت کی دہلیز تک پہنچانے میں ان کرداروں نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اس کی محبت کرنے والی دادی نے خاندان کے بچوں کو ایک کٹھ پتلی تھیٹر کرسمس کے تحفے کے طور پر دیا تھا، اور اصلاً یہی نقطۂ آغاز تھا جس کے بعد گوئٹے کی ڈرامے میں دلچسپی تمام زندگی برقرار رہی تھی۔ اس کے برعکس گوئٹے کو سیاست کا شوق اپنے نانا سے ملا تھا۔ اس نے اس وقت کو تمام زندگی یاد رکھا جب اس کو ایک بزرگ مجسٹریٹ کی معیت میں رہائشی مقامات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ گوئٹے کا باپ اپنے وقت کا ایک قابلِ تعظیم وکیل تھا اور گوئٹے کو گوئٹے بنانے کے سلسلے میں اس نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا وہ اپنے بیٹے کو ایک نامور شخصیت (Celebrity) بنانے کا خواہش مند تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا وکالت کا پروفیشن اختیار کر کے اس میں خوب نام کمائے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات کا بھی خواہاں تھا کہ گوئٹے ادب، فنونِ لطیفہ، موسیقی، منطق، غیر ملکی زبانوں اور اُصولِ قانون کے مختلف شعبوں میں اپنی دلچسپی کو برقرار رکھے، اور اپنے ناقابلِ تسخیر کارناموں سے جاوداں حیثیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ گوئٹے کی ماں ایک ایسی خاتون تھی جس کے اندر قدرت نے مقناطیسی کشش کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ یہ اس کی کرشمہ ساز شخصیت کا کارنامہ تھا کہ جس کی بدولت گوئٹے کے اندر اردگرد کے لوگوں کے تعلق سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس نے شاعری اور صداقت کا دامن زندگی بھر مضبوطی سے تھامے رکھا تھا۔

جب فریڈرک دوم کے سیاسی داؤں پیچ نے جرمن کیعفنڈریشن کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا تو فرانسیسیوں نے عسکری قوت کے بل بوتے پر فرینک فرٹ (Frn Furt) کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اگرچہ اس واقعے نے جرمن قوم کی پُرشکوہ انا پر کاری ضرب لگائی تھی لیکن ایک طرح سے یہ سیاسی سانحہ گوئٹے کے اہل خاندان کے ادبی اُفق کو وسیع تر کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ بھی بن گیا تھا۔ چونکہ اب شہر میں فرانسیسی تھیٹر بھی سامانِ تفرج کے ساتھ نمودار ہو گیا تھا، اس لیے گوئٹے کا باپ اس کو اکثر و بیشتر لے جانے لگا تھا۔ دونوں باپ بیٹے تھیٹر کے ڈراموں کے بوقلموں موضوعات اور ان کے کرداروں کے تعلق سے ناقدانہ انداز میں گفتگو کرتے۔ گوئٹے نے بارہا محسوس کیا تھا کہ اس کا نقطۂ نظر، اس کا مافی الضمیر اس کے باپ کے خیالات و محسوسات، اس کے زاویہ فکر سے

متصادم ہوا ہے۔ یہ شاید گوئٹے کے سوچ کی انفرادیت تھی کہ وہ اردگرد کی اشیاء کے علاوہ ادب اور فنونِ لطیفہ کو بھی ایک خاص انداز سے دیکھتا اور پرکھتا تھا۔ شہر میں فرانسیسی تھیٹر کی آمد نے جیسے گوئٹے کے جمالیاتی احساسات کو دو چند کر دیا تھا۔ اسے پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ فن ڈرامہ، شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ کے بغیر اس کی زندگی کلیتاً نامکمل ہے۔ فرانسیسی ادب کا مطالعہ یوں اس پر بالواسطہ طور پر اپنے اثرات مرتب کرتا جا رہا تھا کہ وہ خود بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں تھا۔ اگرچہ گوئٹے کو بلا مبالغہ فرانسیسی ادب سے شغف تھا مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ عالمی ادب سے دستکشی اختیار کر کے محض فرانسیسی ادب کا ہو کر رہ جائے۔ اس سے پہلے کہ یہ سیلاب اس کو بہا کر نا ''معلوم نہج'' پر لے جاتا اس نے اس کے اثرات سے خود کو محفوظ کرنے کی خاطر اپنی بہن کورینلیا (Cornelia) کے ساتھ انگریزی زبان کی تعلیم بھی حاصل کرنا شروع کر دی۔ اگرچہ فرینک فرٹ فرانس کے زیرِ تسلط تھا، اور شہر کی آبادی کی ایک بڑی اکثریت فرانسیسیوں سے نفرت کرتی تھی مگر شہر میں موجود سیاسی تناؤ اور کشیدگی کے باوصف گوئٹے کا گھرانا شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ کے حوالے سے ثروت مند ہوتا جا رہا تھا۔ یہ دور گوئٹے کی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل تھا کہ اس کے گھر میں ہمہ وقت تخلیقی فن کاروں کی بھیڑ لگی رہتی تھی اور ادبی نشستوں میں تازہ کار تخلیقات پر جوشیلے پیرائے میں گھنٹوں بحث و تمحیص ہوا کرتی تھی۔

گوئٹے کی زندگی پہلی مرتبہ اس وقت ایک غیر محسوس مگر اہم داخلی جذباتی تبدیلی سے متعارف ہوئی جب مقناطیسی حسن رکھنے والی گریشن (Gretchen) نے اسے رشتے کی بہنوں کے ساتھ اس کے گھر کی دہلیز پر پہلا قدم رکھا تھا۔ اس نے محسوس کیا جسے کسی غیر مرئی قوت نے اس کے روزمرّہ کے معمولات کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ جن جذبات سے وہ اب تک ناآشنا تھا وہ یوں اس کے اندر بیدار ہوئے ان کو بے لگام ہونے سے روکنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا۔ گوئٹے نے اپنی سوانح عمری میں اعتراف کیا ہے کہ اس کی نوجوانی کے اس پہلے جذباتی موڑ نے اس کی زندگی پر دور رس اثرات مرتب کیے تھے۔ گریشن سے ملنے کے بعد ہی گوئٹے نے محسوس کیا کہ اس کی روح تو محبت کے تعلق سے جنم جنم کی پیاسی ہے۔ اس نے اس بات کو بین السطور میں بیان کیا ہے کہ اگر گریشن اس کی زندگی میں نہ آتی تو شاید فن کار گوئٹے فن کی آسمانی بلندیوں کو چھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ یقیناً گریشن کی کرشمہ ساز قربت کا اعجاز تھا کہ اس نے زندگی کے سنجیدہ موضوعات پر تمحیص کرتے ہوئے فن شاعری کا آغاز کیا شاید گریشن کو پہلی ملاقات ہی میں گوئٹے کے اندرون کے بالغ تخلیقی رجحانات اور فن کارانہ صلاحیتوں کی بابت بہت کچھ معلوم ہو گیا تھا کہ اس نے شاعری کے حوالے سے گوئٹے کی حوصلہ افزائی کی اور اس کے اندر کے خاموش اور غیر متحرک فن کار کو تحریک و ترغیب کے ذریعے فعال بنا کر رکھ دیا۔ مگر اس وقت کے غیر پختہ کار گوئٹے کی شاعری تو جیسے گریشن کے نام تھی کہ وہ اس کی قربت میں اپنے آپ سے بے نیاز ہو جاتا، اور اس کا جذباتی ہم زاد شاعر گریشن کی صحبتوں میں ڈوب کر رومان انگیز اشعار کے ڈھیر لگا دیتا۔ ایسے ہی غیر زمینی حالات میں جب ایک دن

گریشن نے گوئٹے کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی کو چوم لیا تو جیسے نوعمر جذباتی شاعر اپنے آپ پر قابو پانے کی لاکھ کوششوں کے باوجود اپنے آپ میں نہ رہ سکا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب کسی غیبی آواز نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی کہ۔ ''گوئٹے وقت آگیا ہے کہ اپنے جذبات کو گریشن کے قدموں پر رکھ دو۔ جو کچھ گریشن کے تعلق سے تمہارے دل میں ہے اسے فوری زبان پر لے آؤ کہ آج کا کائنات کا ذرہ ذرہ تمہارے اعتراف کو سننے کے لیے بے تاب ہے۔'' شاید یہ اس کی نوعمری کے خام جذبات کا سیلاب تھا کہ پلک جھپکے سے پہلے ہی اس کو نہ جانے کہاں سے کہاں بہا کر لے گیا۔ جب ہوش آیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس نے اپنے ساتھ وہ سب کچھ کر دیا ہے جو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ گریشن اس سے عمر میں بڑی تھی اور گھمبیر متانت اس کی فطرت کا خاصہ تھی۔ جذبات کے جس شدید سیلاب نے گوئٹے کو خس وخاشاک کی طرح بہا دیا تھا، اس کی نا قابل بیان صلاحیت گریشن کا قطعاً متزلزل نہیں کر سکی تھی۔ وہ گوئٹے کے ''مقدس اعتراف'' کو سننے کے بعد یوں اسے دیکھے جا رہی تھی جیسے ایک تجربہ کار خاتون کس بچے کی معصومانہ حرکت کو دلچسپی سے دیکھتی ہے۔ گریشن نے گوئٹے کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس نے اسے سمجھنے میں ایک گمراہ کن غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ گوئٹے کے باب میں اس کے جذبات کو ایک طرح کی روحانی محبت ہی کا نام دیا جا سکتا تھا۔

گریشن نے گوئٹے کی خود فریبی کے طلسم کو توڑا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی بے نام ہزیمت خوردگی کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ شاید اس خوب صورت دوشیزہ کی استابری اور نخوت زدگی کا نقطہ کمال تھا کہ اس کی ذاتی انا، اس کی نارسائی کے احساسات اس کی کچلی ہوئی روح کے اندھے کنوئیں میں تا دیر تڑپتے رہ گئے۔ اس کی اذیت کوشی کی کیفیت اس وقت اندمال کے عمل سے سے ممزوج ہوئی جب اس کی بہن کورینلیا نے آگے بڑھ کر اس کے بھٹکتے ہوئے ہم زاد کو جذباتی ترفع کی راہ پر گام زن کر دیا۔ یہ گوئٹے کی جواں سالی کا ایک اور اہم موڑ تھا۔ ایک عورت نے اس کی محبوبہ نہ بن کر اس کے دھنک رنگ جذبات کا خون کر دیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ اس کی نارسائیوں کا سلسلہ دراز ہوتا، دوسری عورت، بہن کی محبت کے بسیط احساسات لے کر اسکے قریب پہنچ گئی تھی، اور یوں اس کے جذبات کے خون کا خون بہا ادا ہو گیا تھا اس کو ہم گوئٹے کی زندگی کے بہت سارے اہم واقعات میں سے ایک اہم ترین واقعہ شمار کر سکتے ہیں اس کے بعد تا دم مرگ گوئٹے نے عورت کو کبھی نا قابل اعتماد تصور نہیں کیا تھا!

گریشن سے ترکِ تعلقات کے بعد ضیافتِ میکائل (Michael Mas) کا وقت آن پہنچا تو گوئٹے نے محسوس کیا کہ اس کے ذہن کی بند کھڑکیاں کھل گئی ہیں۔ اب وہ ایک خود بین وخود شناس انسان کی طرح اپنا تجزیاتی مطالعہ کر سکتا تھا۔ اب اس کے خیالات کا مرکز وہ یونیورسٹی تھی جس سے وہ عنقریب حصولِ تعلیم کی غرض سے منسلک ہونا چاہتا تھا۔ مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ یہاں بھی امتناعات اور بندش اس کا راستے میں انتظار کر رہی ہیں۔ اس کی مرضی کے برخلاف اس کا سخت گیر، ضدی باپ نہیں چاہتا تھا۔ وہ Gottingen کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل

کرے۔ گوئٹے کے مستقبل کے حوالے سے اس نے جو خواب دیکھ[illegible] وہ گوئٹے کے اپنے خوابوں سے ایسے متصادم ہو گئے تھے کہ اس کی فرسٹریشن ہر قسم کی حد بندی کو عبور کر [illegible]۔ اس کے باپ کی خواہش تھی کہ گوئٹے Gottingen کی بجائے Leipsic کی معروف قانونی درس گاہ میں [illegible]نون کی اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کرے، اور ایک معزز قانون داں کی حیثیت سے جرمن معاشرے میں شہرت کے اونچے آسمانوں پر پہنچ جائے۔ اس کو بوالعجبی ہی میں شمار کیا جاسکتا ہے کہ اپنے باپ سے عدم اتفاق کے باوجود گوئٹے نے حرفِ تعرض کو نوکِ زبان پر لانے کی کوشش نہ کی مگر اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ اپنی تعلیم کے دوران وہ انسانی سرشت کے گوناگوں ابعاد کا بھی بہ نظرِ امعان مطالعہ جاری رکھے گا۔ اصلاً انسانی فکر و جذبے کے تعامل پر نظر رکھنا اور دیگر بدلتے ہوئے متعلقہ پہلوؤں کا تجزیہ کرنا گوئٹے کے مشاہدے کے ناگزیر اجزائے ترکیبی تھے۔

گوئٹے نے حصولِ تعلیم کے دوران بلاشبہ یادگار وقت بھی گزارا تھا۔ یہ اس کی خوش بختی تھی کہ اسے اپنے وقت کے ان عدیم المثال تخلیقی دماغوں سے متعارف ہونے کا موقع ملا جو تعصبات سے بالاتر ہو کر کا بینائی حقائق کا ادراک کرسکتے تھے۔ اس دوران اس نے بارہا محسوس کیا کہ اس کی فن کارانہ سرجوشی اس کی حرکی توانائی اور اس کے تجسس کے احساسات فزوں تر ہوتے جارہے ہیں۔ اب وہ کہنہ مشق تخلیق کاروں کے سامنے بلاتخوف اپنا نقطہ نظر بیان کرسکتا تھا۔ یہ شاید اطراف کی آزاد فضا کا اثر تھا کہ وہ بلاتامل دوسروں کے زاویہ ہائے نگاہ سے اختلاف کی جرأت بھی کرسکتا تھا اسے اپنے باب میں بارہا یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی نابغہ روزگار کے نظامِ فکر سے لیس ہو چکا ہے۔ یہ احساس اس کے اندر سرایت کر چکا تھا کہ ہر لمحے اس کے ذہنی افق کا کینوس وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ اسی دوران اس نے شدومد سے محسوس کیا کہ روایتی اقدار سے الگ ہوجانے کے خوف کے باعث لوگ عصری شعور اور اکتسابِ علم و ادب کے فیوض سے محروم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ گوئٹے نے اپنے وقت کے تعلیمی نظام کا بھی تجزیہ کیا تھا اور اس حوالے سے اس نے تمسخر آمیز انداز میں یونیورسٹی کے اساتذہ کو بھی تنقید کا ہدف بنایا ہے اس کا خیال تھا کہ اس کے پروفیسرز کے لیکچرز، اور ان کے خیالات اس کی تخلیقی نامیاتی قوت اس کے داخلی جذبات کو مہمیز نہ کرسکے تھے۔ اپنے بعض ممتاز پیش رووں اور معاصرین کے درمیان گزارے ہوئے یادگار لمحات کے ماسواء، جن کا درسی نظام سے کوئی تعلق نہ تھا، گوئٹے کے نزدیک اس درس گاہ میں اس کا قیام بوجھل اور اکتاہٹ سے بھرپور تھا۔ پایانِ کار جب بیماری صحت یابی حاصل کرنے کی خاطر اس نے ۱۷۶۸ء میں مذکورہ درس گاہ کو خیر باد کہا تو وہ ناخوش نہیں تھا۔

اس کے بعد گوئٹے قاری کو بتاتا ہے کہ اس کی بحالی صحت کا مرحلہ نہ تو طویل تھا اور نہ اذیت کوش۔ بلکہ اس کے برعکس بڑا خوش آئند ثابت ہوا تھا۔ وہ تندرستی کا تذکرہ کرتے ہوئے گرم جوشی اور ولولہ انگیزی کا مظاہرہ کرتا ہے کیونکہ صحت کی واپسی کے ساتھ اس کے اندر وہ قوتیں بیدار ہو گئی تھیں جو اس کے نزدیک مبدء حقیقی سے متنفر ہوئی تھیں۔ اگرچہ اس نے یہ بات براہِ راست نہیں کہی تھی مگر اس مفہوم کا استنباط ایک قاری از خود اس کی تحریر کو پڑھنے

کے بعد کر سکتا ہے۔

اس کے خیال میں ان تازہ کار روحانی تجربات کی حقیقی وجہ اس کی Rau von kletten berg سے وہ ملاقاتیں تھیں جن میں فلسفیانہ موضوعات زیر بحث آتے رہے تھے۔ یہ شخص اس کے خاندان کا ایک دیرینہ واقف کار تھا اور اس کی کشش انگیز، سنجیدہ شخصیت اس کی بے پایاں اندرونی صلاحیتوں کی آئینہ دار تھی اس نے گوئٹے کی علالت کے دوران اس سے مختلف النوع موضوعات پر سیر حاصل بحث کی اور گوئٹے کو محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ یہ ناخوشگوار وقت کتنی جلدی رخصت ہو گیا ہے۔ ان دنوں Kletten Berg اس کے قریب موجود نہ ہوتا تو گوئٹے سائنس کی کتب کا مطالعہ کرتا یا تاش کے پتے کولے کرتن تنہا کھیل میں مصروف ہو جاتا۔ یہ ایک اتفاقی امر تھا کہ اس کو اپنے وہ بہت سارے خطوط بھی مل گئے تھے جو اس نے یونیورسٹی کے قیام کے دوران اپنی فیملی کے نام لکھے تھے۔ اپنی ہی تحریر کو بار دگر پڑھتے ہوئے اسے عجیب سی نامانوس کیفیت سے ہمکنار ہونا پڑا۔ اگرچہ یہ تجربہ اس کے لیے بالکل ہی نیا تھا مگر اس نے اس کی دلچسپی کو مہمیز کر دیا تھا۔

جب بیماری کا وقت گزر گیا تو گوئٹے نے اپنے اندر ایک بے حد فعال ہم زاد کو سرگرم عمل پایا۔ اس نے قانون کی نامکمل تعلیم کی تکمیل کا عزم کیا اور اسٹراس برگ کی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اس مرتبہ اس کے خوابوں کی اڑان آسمانوں سے باتیں کر رہی تھی۔ یہ شاید اس کی خوش قسمتی تھی کہ یونیورسٹی میں اس یوہان ہرڈر (Yohann Herder) جیسے معروف و معتبر نقاد اور شاعر اور ایک زیرک اُستاد کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔ ان دنوں ہرڈر ایک مقبول عام تحریک Storm and Stress کی قیادت کر رہا تھا جس نے جرمن ادب پر اپنے انقلابی اور دیرپا اثرات مرتسم کیے ہیں گوئٹے تمام زندگی اس دور کو فراموش نہ کر سکا کہ اس دوران اس کو شیکسپیئر کی زندہ جاوید تحریروں کو غور و تمحیص سے پڑھنے کا موقع میسر آیا تھا۔ اس نے اس عہد کے تناظر میں اس بے مثال تمثیل نگار کے ڈراموں کے جرمن تراجم کے تعین قدر کے سلسلے میں جن افکار و آراء کا اظہار کیا ہے اس سے گوئٹے کی شیکسپیئر کی تمثیلات میں بے انتہا دلچسپی کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک جگہ اس خودنوشت سوانح میں اس عظیم جرمن رائٹر انگریزی زبان کے نابغہ عصر کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عالمی ادب کے جرمن قارئین شیکسپیئر کی عظمت اور توقیر کو انگریزی قارئین سے زیادہ مؤثر انداز میں تسلیم کرتے ہیں۔ اسٹراس برگ کی یونیورسٹی میں حصولِ تعلیم کے دوران اس وقت جیسے اولیور گولڈ اسمتھ کے ناول Hevicar of Wakefield نے مجسم حقیقت کا روپ اختیار کر لیا تھا جب گوئٹے کی ملاقات اتفاقی طور پر ایک ایسے خاندان سے ہو گئی تھی جس کی ایک دوشیزہ فریڈریکا بریون (Frederica Brion) کا لازوال حسن ناول کی دو بہنوں اولیورا اور صوفیہ کی تانبا کی خوب صورتی کی طرح ہر چمکتی شے کو شرمندہ کر سکتا تھا۔ فریڈریکا کو دیکھ کر گوئٹے کی جذباتیت کے سارے مقفل دروازے خود بخود کھلتے چلے گئے۔ اس نے محسوس کیا جیسے قدرت نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہوا یہ بے مثل شاہکار اسے ودیعت کر دیا

ہو۔ اب جیسے کوئی چیز اس کے اختیار میں نہ تھی، اور جب وہ کسی بے بس دھات کے بے جان ٹکڑے کی طرح فریڈریکا کی مقناطیسی آغوش میں پہنچ گیا تو جیسے سات رنگوں سے مزین قوسِ قزح کی دنیا اس کی روح کا مستقل مستقر ہوگئی تھی۔ گوئٹے نے فریڈریکا کی محبت اور اپنی بے مثل شاعرانہ صلاحیتوں کے تعامل (Interaction) کی بنیاد پر جو شاعری کی ہے وہ بین الاقوامی ادب کے ایوانوں میں ہمیشہ گونجتی رہے گی۔ اس ضمن میں ہم بلا پس و پیش اس کی غنائیت سے بھرپور تخلیق "Wanders Sturmlied" کو قارئین کی نذر کر سکتے ہیں۔

گوئٹے نے ۱۶ اگست ۱۷۷۱ء کو اسٹراس برگ سے ڈگری حاصل کی اور اس کے دوسرے ہی دن پروفیسر شوپلن (Professor Schopflin) کا انتقال ہوگیا۔ اس موقع پر گوئٹے نے اپنی ڈائری میں آنجہانی پروفیسر کی مختصر سوانح حیات، اس کے کردار اور اس کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے اور پھر ایک طویل جملہ معترضہ کے طور پر اسٹراس برگ کے دوسرے پروفیسرز اور ان کے حوالے سے اپنے ردِ عمل کو قلمبند کیا ہے۔ پروفیسر شوپلن کی بابت گوئٹے کی متعلقہ تحریر کے مطالعے سے یہی ظاہر ہوتا کہ اس سے بعض افکار کے تناظر میں اختلاف رکھنے کے باوجود وہ متوفی پروفیسر سے کافی متاثر رہا تھا۔ گوئٹے نے ڈگری حاصل کرنے کے بعد اسٹراس برگ کو چھوڑا تو اس کے ساتھ ہی اسے فریڈریکا کو بھی چھوڑنا پڑا۔ اگرچہ اس کے بعد وہ پھر کبھی زندگی میں فریڈریکا سے نہیں ملا تھا مگر چونکہ وہ گریشن کے برعکس وہ اس کی پختہ کار محبت تھی اس لیے گردشِ زمانہ کی نذر ہو جانے کے باوجود اس کا تخیلی وجود گوئٹے کے اندرون میں سمایا رہا۔

یونیورسٹی سے فارغ التحصیلی کے بعد گوئٹے کی سوئی ہوئی سیلانی روح اچانک انگڑائی لے کر بیدار ہوگئی اور اس نے پروفیشنل کیریئر کی شروعات سے پہلے کچھ عرصہ سفر و سیاحت میں گزارا۔ یہ وقت اس کے لیے یادگار حیثیت کا حامل تھا کہ اس دوران گوشہ چشم سے انمول پیش آمدہ واقعات و مشاہدات کا احاطہ کرنے کے علاوہ اس کو اپنے عہد کے چند معروف صاحبانِ فکر و نظر سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا۔ اپنے وقت کے نامی گرامی رائٹرز اور دانشوروں سے ملاقاتوں کے بعد گوئٹے کو پہلی مرتبہ اپنی فکری بلوغت، اپنے فہم و ادراک کی گہرائی کا احساس ہوا۔ اس نے متعدد مرتبہ بحث و تمحیص کے دوران محسوس کیا کہ اس کے افکار و آراء سے اختلاف رکھنے والے بھی اس کی استدلالی صلاحیت، اس کے تازہ کار خیالات سے بے حد متاثر ہیں۔ علاوہ ازیں ان میں ادب کی حرکی توانائی سے لیس وہ معاصرین بھی شامل تھے جنہوں نے بعد ازاں گوئٹے کے ادبی مسلمات کو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر متاثر کیا تھا۔ اس وقت کو فراموش کرنا ویسے بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ انہی دنوں اس کے قریبی دوست یوہان شلوسر (Yohann Schlosser) نے اس کی محرم راز بہن کورنیلیا کو شریکِ حیات بنانے کے اپنے مصمم ارادے کو سب پر واضح کر دیا تھا۔ گوئٹے نے اپنی خودنوشت سرگزشت میں اس دور کے حوالے سے Herr Von La Roche اور اس کی بیوی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جن کی قربت میں اس نے بڑا کارآمد وقت گزارا تھا اور گھنٹوں

ان کے ساتھ بیٹھ کر ادب کے مختلف موضوعات پر مبسوط انداز میں بحث آرائی کی تھی۔ یہ بھی ایک دلنشین اتفاق تھا کہ گوئٹے La Roche ہی کی معرفتِ یوہان مرک (Yohann Merck) اور اس کی فیملی کے افراد سے ملا تھا جن کے ساتھ بعد میں اس نے سیر و سیاحت کے تعلق سے بڑا یادگار وقت گزارا تھا۔ اس کے بعد خودنوشت سوانح حیات کا حصہ گوئٹے کے پیشہ ورانہ تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے۔ اس نے وکیل کی حیثیت سے عدالتی ایوانوں میں جن استعادی کارروائیوں کو انصاف کے تقاضوں سے متصادم دیکھا تھا، ان کو اس نے جامعیت اور شفافیت کے ساتھ اپنی آپ بیتی میں قلمبند کیا ہے۔ اس نے ان قانونی اصلاحات کا بھی تذکرہ کیا ہے جن کے نفاذ کے سلسلے میں اس وقت کی حکومت نے عملی اقدامات کیے تھے فی الحقیقت یہ وہ سیاسی کارروائیاں تھیں جو وکلاء اور مصنّفین کے تاثرات کے ردِّعمل کے طور پر نافذ العمل ہوئی تھیں اور جن کا تعلق انصاف کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال کو بہتر بنانا تھا اس موقع پر گوئٹے ادب اور ڈرامہ نگاری سے بھی بحث کرتا ہے جن کے بغیر اس کے اندر کے فن کار کی سائیکی کی تشکیل و تجسم ناممکن ہوتی۔ پھر وہ طباعت و اشاعت کے حوالے سے اپنی دو تخلیقات یعنی The Accomplice اور The Sorrows of Young Werther کا تذکرہ کرتا ہے جن کو اس نے کچھ عرصے قبل مکمل تو کر لیا تھا مگر تا حال وہ منظرِ عام پر نہیں آئی تھیں۔ گوئٹے اس دن کو کبھی بھول نہیں سکا تھا جب اس نے The Sorrows of Young Werter کا مسوّدہ بغرضِ طباعت پبلشرز کے حوالے کیا تھا۔ ویسے بھی وہ ایک یادگار دن تھا کہ اس دن اس کی معتمد خاص، اس کی محرم راز بہن کورنیلیا ازدواجی رشتے میں منسلک ہوگئی تھی۔

اس کے بعد گوئٹے کی خودنوشت سوانح میں شعلہ روحسینہ للی شون مین Lli Schonemann کا تذکرہ آتا ہے جس کی محبت کا جام پی کر وہ بدمست و مدہوش ہو گیا تھا۔ للی سے اس کی ملاقات ایک پارٹی میں ہوئی تھی اور اچانک اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس دوشیزہ کے نورانی حسن کے ہیولے کا زندانی ہو کر رہ گیا ہے۔ للی کا بیک گراؤنڈ، اس کے کوائف گوئٹے کی معاشرتی اقدار اس کی خاندانی روایات سے کافی حد تک ہم آہنگ تھے۔ گوئٹے کی رومان انگیز فطرت نے پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی یہی محسوس کیا کہ للی کا اس سے لمحاتی تعلق نہیں ہے، اور وہ دونوں اس کرہ ارض پر ایک ساتھ زندگیاں گزارنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ نوجوانی کے اس آوارہ خواب کی قوسِ قزح نے دونوں کے مچلتے ہوئے جذبات کو سات رنگی پوشاک پہنا دیا تھا۔ اب وہ دونوں ہر جگہ ایک ساتھ دیکھے جانے لگے تھے کبھی وہ اونچے طبقے کے ریستورانوں میں ڈنر کرتے ہوئے ادب، شاعری اور زندگی کے ہر سنجیدہ و غیر سنجیدہ موضوع پر جم کر بحث آرائی کرتے تو کسی اور وقت کسی اوپیرا یا تھیٹر میں بیٹھ کر فن کی جادواں پُر اسراریت میں ڈوب کر رہ جاتے۔ لیکن گریشن اور فریڈریکا کی طرح للی بھی گوئٹے کی زندگی کا مستقل حصہ نہ بن سکی اور حالات کے میلِ رواں میں دونوں ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے پر مجبور ہو گئے۔

یہ وہ وقت تھا جب گوئٹے کی زندگی عملی تغیرات کے سانچے میں ڈھل کر رہ گئی تھی۔ اب وہ Wertzler کی

عدالت میں مقدمات اور قانونی کاروائیوں کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کی کوششوں میں لگا رہتا تھا۔اس کے خاندانی حالات بھی تبدیلیوں کے مراحل سے گزر رہے تھے۔اب اس کی عزیز ترین بہن کورینلیا بھی ازدواجی زندگی کے حقائق کا سامنا کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر تجرد کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئیں تھی اب وہ دوبارہ گوئٹے کے لیے دست راست کی حیثیت اختیار کر چکی تھی یہ اسی کا مشورہ تھا جس کو قابل ترجیح تسلیم کر کے گوئٹے نے اپنی راہوں کو للی کی راہوں سے جدا کر دیا تھا۔ اگرچہ گوئٹے کا ایک اور عشق ناکام ہو چکا تھا لیکن اس کی زندگی ادبی و شعری کارناموں کے حوالے سے قطعاً ناکام نہ تھی، بلکہ بہت زیادہ کامیاب تھی اس کے ناول **The Sorrows of Young Werther** کی زبردست پذیرائی کے سبب اب وہ یورپ کے ادبی اُفق کا ایک بے حد تابندہ ستارہ بن چکا تھا۔اس غیر متوقع موڑ پر اچانک گوئٹے کی خودنوشت سوانح حیات اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔

جدید نقد و نظر (New Critics) کے مسلمات کی رو سے کسی ادیب کے نقطۂ نظر کو متاثر کرنے کی دانستہ کوشش کو غیر مباح اور غیر مستحسن سمجھا جاتا ہے۔یہ ایک ایسا تنقیدی پیمانہ ہے جس کی وجہ سے ایک قلم کار ادبی بندشوں اور قدغنوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔اس مقیاس کی بدولت ایک مصنف حسب منشا نتائج کے استخراج کے سلسلے میں اپنی کسی بھی تحریر کو، اس کی بین السطور اکائی کو ابہام و اہمال کی نذر کر سکتا ہے گوئٹے نے یوں تو اپنی خودنوشت میں اپنی زندگی کے واقعات و مشاہدات اور اپنے زاویہ نگاہ کے داخلی پیغام کو قارئین کے سامنے وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا ہے مگر اس کے باوجود یوں لگتا ہے جیسے آپ بیتی کے امکانات و ابعاد اور ان کے حوالے سے معنویت کا عمودی عمق قاری پر منکشف نہیں ہوا ہے۔سب کچھ بالاستیعاب پڑھنے کے باوجود تشنگی کا احساس شدومد سے اجاگر ہوتا ہے۔اس خودنوشت کو پڑھنے کے بعد قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس میں جو کردار پیش ہوئے میں ان کی اور گوئٹے کی حیثیت دریا کے دو کبھی نہ ملنے والے مخالف کناروں سے مختلف نہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ آپس میں بچھڑ جانے کے بعد گوئٹے اپنی زندگی میں دوبارہ ان سے کبھی نہیں مل سکا تھا۔اس خودنوشت کے تعلق سے ہم گوئٹے کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے متعارف تو ہو جاتے ہیں مگر اس کے باوصف محسوس یہی ہوتا ہے کہ ہم حقیقی گوئٹے کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔تھامس مان (Thomas Mann) نے کتاب کے مطالعے کے باوجود قاری کے نزدیک ایک معمہ، ایک پہیلی بن کر بین السطور میں یوں چھپا رہتا ہے کہ لاکھ کوششوں کے بعد بھی ہمارے سامنے نہیں آتا۔شاید یہ سچ ہے کہ گوئٹے نے اپنی جیون کتھا لکھنے کے باوجود خود کو منکشف کرنے سے گریز کیا ہے۔

❀❀

Address:
E-2-8/14 Maymar Square
Block 14 Gulshan-e-Iqbal
Karachi.

آزاد گلاٹی: نور کا بوسہ اور برہمن رات کے رخسار

شمس الرحمٰن فاروقی

آزاد گلاٹی نے جب دنیائے ادب میں قدم رکھا تو وہ اس نئے گلشن سے دوچار ہوئے جس میں خلیل الرحمٰن اعظمی، بمل کرشن اشک، عمیق حنفی، محمد علوی، بلراج کومل جیسے غیر معمولی شعرا کی باغیانہ اور تجربہ کوش قوتوں نے نئے نئے خیاباں سجا رکھے تھے۔ یہ شعرا فیض اور سردار جعفری کے بجائے میرا جی، ن م راشد اور اختر الایمان، اور بڑی حد تک مجید امجد کو اپنا پیش رو قرار دیتے تھے۔ ہر طرف یہی آواز تھی کہ بقول محبوب خزاں، کم کہو، اچھا کہو، اپنا کہو، ناصر کاظمی اور ان کے کچھ ہی بعد سلیم احمد نے اپنی طرح کی غزلیں کہنا شروع کر دی تھیں اور ان کی وجہ سے ان شعرا کو بھی راستہ مل رہا تھا جو نظم سے زیادہ غزل کو اپنا میدان قرار دیتے تھے۔ اس زمانے کی ادبی فضا کا تصور وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس کے عینی شاہد تھے، خواہ وہ اس فضا کی تعمیر و تشکیل میں شریک نہ رہے ہوں۔

اس نئے گلشن میں باغبان اور صیاد کا گذر نہ تھا۔ یہاں ہر شخص کو آزادی تھی کہ تجربے کرے، اظہار ذات کی مکمل سعی کرے، خواہ اس کوشش کے نتیجے میں جو کلام رو پذیر ہو وہ ہر ایک کو پسند نہ آئے۔ یہاں کا طرز و طور یہ تھا کہ سب کو اپنی کہنے کا حق ہے اور دوسروں کی سننا بھی ضروری ہے۔ پورے ماحول میں تازگی کی مہک تھی اور ہر نیا آنے والا اپنی آواز اور اپنا موضوع سخن دریافت کرنے میں منہمک تھا۔ نظم کی طوالت اگرچہ نامقبول نہ تھی، لیکن اس وقت یہ بات ثابت کرنے کی کوشش زیادہ تھی کہ ہم تھوڑے سے لفظوں میں بہت کچھ کہہ سکتے ہیں۔ غزل میں بھی ''قادر الکلامی'' کی نمائش کے بجائے اپنے احساسات کو غصے بھری زبان میں، یا گہرے تفکر کی زبان میں، یا زرد کے گہرے بھورے رنگوں میں ملبوس زبان میں بیان کرنے کا چلن بڑھنے لگا۔ ہر طرف ایک دل خوش کن سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی۔

یہی وہ وقت تھا جب ان شاعروں نے اپنی آواز بلند کی جنھیں بعد میں سنہ ساٹھ کی دہائی کے شاعر کہا گیا۔ ایک طرح تو ان کا کام آسان تھا، کیونکہ ان کے پیش رو کچھ نہ کچھ راہ کو ہموار کر گئے تھے، لیکن ایک طرح ان کا کام بہت مشکل بھی تھا، کیوں کہ یہ شعرا پچھلوں سے زیادہ جرأت مند تھے۔ لہٰذا ان کے یہاں انحراف کا انداز بہت نمایاں تھا، بلکہ اکثر تو جارحانہ حد تک نمایاں تھا۔ ان شعرا میں دو صفات کم و بیش مشترک تھیں۔ ایک تو یہ کہ ان میں سے زیادہ تر شعرا نے مغربی ادب کا براہِ راست مطالعہ کیا تھا اور یہ مطالعہ صرف چند مشہور ناموں تک محدود نہ تھا۔ اور دوسری بات یہ کہ ان میں سے زیادہ تر شعرا کے لیے شاعر اپنی ذات کی گہرائیوں میں اترنے کے عمل سے عبارت تھی۔ شاعری ان کے لیے ذریعہ معاش نہ تھی اور نہ ہی وہ شاعری کو انقلابی عمل سمجھتے تھے۔ یعنی ان کے نزدیک یہ بات قطعاً ضروری نہ تھی کہ شاعری کو سماجی یا سیاسی تبدیلیوں کے میدان کا سپاہی تصور کیا جائے۔ وہ

آسکر وائلڈ کی طرح یہ تو نہیں کہتے تھے کہ ''فن کا کوئی مصرف نہیں''، لیکن وہ یہ ضرور کہتے تھے کہ فن کو کسی بھی ایجنڈا کا پابند نہ ہونا چاہیے۔

سنہ ساٹھ کی نسل والے ان شعرا میں قوت قیام بہت تھی۔ بعض کو موت لے گئی، لیکن جو زندہ رہے ان میں سے اکثر اب بھی شعر کے میدان میں فعال اور توانا ہیں۔ اگر صرف شمال مغرب کو دیکھیے تو ان شعرا میں پریم کمار نظر، کرشن کمار طور اور آزاد گلاٹی کے نام بہت نمایاں ہیں۔ آزاد گلاٹی نے مختصر نظم پر بطور خاص توجہ کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سردار جعفری جیسے پرانے شعرا بھی مختصر نظم کہہ رہے تھے۔ آزاد گلاٹی کی مختصر نظموں میں منیر نیازی جیسے خوف آگیں اور اندوہ پذیر اسرار نہ تھے، اور نہ ہی ان کی مختصر نظمیں سردار جعفری کی نظموں سی سڈول لیکن شفاف تھیں۔ آزاد گلاٹی نے جو راستہ اپنایا اس پر چلنے والے آج بھی بہت سے نوخیز شعرا موجود ہیں۔ ان میں سے اکثر اس بات سے بے خبر ہیں کہ آزاد گلاٹی اور ان کے ساتھیوں نے ان زمینوں میں دیر تک اور بہت پہلے ہی کنج کاوی کر لی تھی۔ ذیل کی نظم آزاد گلاٹی نے اپنی ادبی زندگی کے آغازی برسوں میں کہی تھی:

معما

دن نکلتا ہے\
ترے رخ سے اجازت لے کر\
رات آتی ہے\
تری زلف کے سائے سائے\
تو یہ کہتی ہے\
کہ تو میری ہے\
پھر یہ ہستی کے شب و روز پرائے کیوں ہیں؟

اگر گستاخی نہ ہو تو یہ عرض کروں کہ اس طرح کی نظمیں آج کل ہر رسالے میں نظر آجاتی ہیں اور ہر شاعر یہ سمجھتا ہے کہ یہ انداز اور یہ مضمون، دونوں ہی عہد حاضر کے، بلکہ خود میرے دریافت کردہ ہیں۔ حقیقت یہ کہ آزاد گلاٹی اس طرح کی نظمیں ۱۹۷۰ء میں، بلکہ اس سے بھی پہلے سے کہہ رہے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی ہر نظم ایسی نہیں ہے، ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ کہیں کہیں فیض اور ساحر کی بھی جھلک ان کے یہاں اس زمانے میں مل جاتی ہے۔ لیکن جن نظموں میں انہوں نے انفرادی تجربے کو اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی ہی رنگ میں بیان کیا ہے، وہ نظمیں آج بھی پڑھی جانے کے قابل ہیں۔

آزاد گلاٹی کی نظموں کا معاملہ بظاہر بہت سادہ ہے، لیکن دراصل ان کی بہترین نظموں کی تعبیر ہمیں اکثر معنی کے نئے منطقوں کی طرف لے جاتی ہے۔ اسی طرح ان کی وہ غزلیں دیکھی جائیں جو ان کی مندرجہ بالا نظم سے بھی

پہلے کی ہیں، اور جو بمل کرشن اشک کے اثر سے خالی ہیں، تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ غزل کی ایک نئی آواز جو آزاد گلاٹی کے کلام میں گونجتی پھرتی ہے، ابھی تک اپنا ثانی پیدا نہیں کر سکی۔

میری دستک توڑ گئی ہے دیواروں کو
دروازے تک آ کر اک سایہ ٹھہرا ہے
آنکھ کھلتے ہی ترے جسم کی خوشبو آئی
رات بھر تو نے مجھے خواب میں دیکھا ہوگا
کتنی یادیں آنسوؤں میں تھرتھرا کر رہ گئیں
اس نے جب پوچھا، کہو آزاد، تم کو کیا ہوا
دل پہ نہ جانے کیا بیتی بات فقط اتنی سی تھی
اب کے بچھڑتے وقت نہ اس نے پوچھا پھر کب آؤ گے
تجھے گنوایا تو کتنے حسین شعر کہے
نہ راس آیا زیاں کوئی اس زیاں کی طرح
آتے جاتے روز تجھے دیکھا کرتے ہیں لیکن پھر بھی
تیرے دل کا درد نہ سمجھے یہ من کے اندھے دروازے
اس کے پاؤں اسے دہلیز پہ خود لے آئے
میں نے پوچھا تھا اجازت ہو تو اندر آؤں

آزاد گلاٹی کی غزل میں کئی لفظ بار بار آتے ہیں: جنگل، شجر، صحرا، تلاش، خلا، گنبد، سایہ، سراب، پھول، بادل، گھٹا، دروازہ، راستہ، شام، چاند، وغیرہ۔ لیکن ان کی مدد سے جو فضا آزاد گلاٹی کی غزل میں بنتی ہے، وہ رسمی جدیدیت کی فضا نہیں۔ احساس کی گہرائی اور گذری ہوئی چیزوں کی یاد کی حدت سے تپتے ہوئے شعر دیکھنے ہوں تو آزاد گلاٹی کی غزل دیکھیے۔

یہی درختوں کے سائے یہ راستہ ہوگا
تمہارے ساتھ مگر کوئی دوسرا ہوگا
اس کے ساتھ ہی اپنی شامیں شامیں صبحیں صبحیں تھیں
اب تو کوئی فرق نہیں ہے اپنے شام سویروں میں
خلوتِ شب میں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ چاند
نور کا بوسہ ہے برہمن رات کے رخسار پر

تیسرے شعر میں انگریزی رومانی شاعری کو ہندوستانی روایت سے ملا کر بالکل نئی فضا پیدا کی گئی ہے۔ چاند کو بوسے کا نشان کہنا ہماری روایت میں نہیں، اور رات کو برہمن کہنا ہماری روایت میں ہے۔ دونوں کا اتنا عمدہ امتزاج حاصل کرنا آسان نہیں۔ مصرع اولیٰ ذرا اور چست ہوتا تو یہ شعر رنگ وسنگ میں شاہوار ہوتا۔ لیکن چاندنی کے مضمون کو ناسخ کے یہاں دیکھیے۔

کیا شب مہتاب میں بے یار جاؤں باغ کو
سارے پتوں کو بنا دیتی ہے خنجر چاندنی

اب اس لاجواب شعر کے سامنے آزاد گلاٹی کا شعر ملاحظہ ہو۔

چن گئے چاندی کی دیواروں میں وہ چند اسے لوگ
جن سے ملنے کے لیے آتی تھی چھت پر چاندنی

آزاد گلاٹی نے شاید غیر شعوری طور پر ناسخ کی زمین اختیار کی ہے۔ یا شاید انہوں نے ناسخ کا جواب لکھنا چاہا ہو۔ دونوں صورتوں میں یہ بات ظاہر ہے کہ جدید غزل نے کس طرح غزل کی پرانی روایت کی توسیع کی ہے۔ ناسخ کے شعر میں ہجر و فراق کا عام مضمون ہے جسے مصرع ثانی کے پیکر نے آسمان پر پہنچا دیا ہے اور آزاد گلاٹی کے شعر میں نئے زمانے کی ہلکی سی گونج لیے کچھ سماجی معنویت کا سا، اور کچھ ذاتی المیے کا سا رنگ ہے۔ آزاد گلاٹی نے چاندی کی دیواروں میں چن دیے جانے اور چند اسے لوگوں کا ذکر کر کے شعری پیکر کو کامل کر دیا جب مصرع ثانی میں ہم چاندنی کا ذکر سنتے ہیں کہ وہ ان چند اسے لوگوں کی صورت دیکھنے آتی تھی۔ لیکن ایک لمحے کے لیے میرے دل میں یہ خیال بھی جاگزیں ہوتا ہے کہ ناسخ کا معشوق ان کے پاس شاید اس لیے نہیں تھا کہ وہ چاندی کی دیواروں میں چن دیا گیا تھا۔

Address:
313/371, Rani Mandi
P.O.Box # 13, Allahabad

متن کی اسلوبیاتی قرأت

مرزا خلیل احمد بیگ

کسی ادبی متن کی اسلوبیاتی قرأت دراصل اس کی لسانیاتی قرأت ہے۔ کیوں کہ اس قرأت کی نظری بنیادیں لسانیات فراہم کرتی ہے۔ اس کا طریقۂ کار بھی لسانیاتی ہے اور اس کی اصطلاحات بھی لسانیات سے مستعار ہیں۔ ان تینوں باتوں کا اطلاق کسی متن کی قرأت کو لسانیاتی بنا دیتا ہے۔ لسانیاتی قرأت کے بعد اگر متن کے اسلوبی خصائص (Style-Features) کی بھی شناخت کی جائے اور انہیں جانچا اور پرکھا جائے تو یہی لسانیاتی قرأت اسلوبیاتی قرأت اس کی لسانیاتی قرأت پر مبنی ہوتی ہے۔ کیوں کہ جب تک کہ متن کو لسانیاتی قرأت سے نہ گزارا جائے اس کے اسلوبی خصائص کی شناخت ناممکن ہے۔

ادب اور لسانیات اگرچہ فکری، فنی اور نظری اعتبار سے نیز اپنے روّیوں اور طریقۂ کار کے نقطۂ نظر سے دو علیٰحدہ موضوعات ہیں لیکن ان دونوں میں گہرا رشتہ پایا جاتا ہے۔ اس رشتے کی بنیاد ''زبان'' ہے۔ زبان لسانیات کا موادو موضوع ہے۔ یہی زبان ادب کا ذریعۂ اظہار بھی ہے۔ اگر زبان نہ ہو تو ادب معرض وجود میں نہیں آسکتا۔ دوسری جانب زبان کی موجودگی لسانیات کی موجودگی کی ضامن ہے کہ زبانوں کے ہی سائنسی مطالعے اور تجزیے کا نام ''لسانیات'' ہے۔ اور زبانوں کی ساختیاتی توضیح (Structural Description) ہی لسانیات کی غرض و غایت ہے۔

چوں کہ ادب کا ذریعۂ اظہار زبان ہے، اس لیے ادب کا مطالعہ و تجزیہ لسانیاتی سطح پر بھی ممکن ہے اور ادبی متن کی لسانیاتی قرأتِ ناگزیر ہے۔ لسانیات کی ادبی متن سے دلچسپی صرف زبان کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا کسی بھی نوعیت کی قرأت متن محض زبان کی ادبی و تخلیقی کارپردازیوں تک ہی محدود رہتی ہے۔ زبان جب ادبی یا تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنتی ہے تو یہ بڑی حدتک عام بول چال کی زبان سے مختلف ہو جاتی ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ زبان کا بنیادی مقصد ترسیل (Communication) ہے۔ جب زبان اپنا ترسیلی فریضہ انجام دیتی ہے تو راست، سادہ اور سپاٹ ہوتی ہے اور مروجہ لسانی ضابطوں، قاعدوں اور اصولوں کی پابند ہوتی ہے۔ ادبی زبان میں ترسیلی وزن (Communicative Load) کم ہوتا ہے۔ کیونکہ ادبی فن پارہ اطلاع رسانی کا کام انجام نہیں دیتا بلکہ جمالیاتی حظ بہم پہنچاتا ہے۔ ادبی زبان بڑی حد تک زبان کے مروّجہ اُصولوں اور قاعدوں کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ ہر ادبی فن کار زبان کے مروّجہ نارم (Norm) سے کسی نہ کسی حد تک انحراف کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ تخلیقی اظہار کے نت نئے انداز ڈھونڈتا ہے، نئے نئے انسلاکات وتلازمات تلاش کرتا ہے۔ نئی لسانی تشکیلات وتراکیب وضع کرتا ہے اور پرانے لسانی مواد کو بھی انوکھے انداز سے استعمال کرتا ہے۔ تخلیقی فن کار کی یہ تمام کوششیں زبان کے

تخلیقی استعمال کے دائرے میں آتی ہیں۔ متن کی اسلوبیاتی قرأت کے دوران ان تمام اسلوبی خصائص کی تلاش اور شناخت جاری رہتی ہے۔ متن کے اسلوبیاتی قاری کو یہ دیکھنا لازم ہے کہ کسی ادیب یا شاعر نے زبان کی کن کن Strategies کا استعمال کیا ہے جن کی وجہ سے زبان ایک خاص امتیازی اہمیت کی حامل بن گئی ہے۔ ان ہی خصوصیات کی وجہ سے ادب میں زبان کا استعمال، زبان کے دوسرے تمام Functions اور وظائف سے مختلف ہو جاتا ہے۔

ادب میں زبان کے ہی مخصوص و منفرد استعمال سے اسلوب (Style) کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ چوں کہ ہر ادیب کے ہاں زبان کے استعمال کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے، اس لیے ہر ادیب کا اسلوب بھی جداگانہ ہوتا ہے۔ غالبؔ کا اسلوب، میرؔ کے اسلوب سے اور فیضؔ کا اسلوب اقبالؔ کے اسلوب سے اس لیے مختلف ہے کہ ان کے ہاں زبان کے استعمال کی نہج و نوعیت جداگانہ ہے۔ اسی بنیاد پر کسی ادیب کی انفرادیت کا تعین اس کے اسلوب کے تجزیے سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ یہ تجزیہ لسانیات کی مختلف سطحوں پر کیا جا سکتا ہے، مثلاً صوتی، صرفی، لغوی، نحوی، قواعدی، معنیاتی وغیرہ اور ہر سطح پر ادبی فن پارے کی اسلوبی خصائص کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔

لسانیاتی مطالعۂ ادب میں بنیادی اہمیت مطالعۂ اسلوب کی ہے اور اسلوب کی تشکیل زبان کے متنوع استعمال پر منحصر ہے۔ اسی لیے لسانیاتی مطالعۂ ادب کو اسلوبیاتی مطالعہ یا اسلوبیاتی تنقید بھی کہتے ہیں جس کی اپنی نظری بنیادیں، اپنے اُصول اور اپنا طریقۂ کار (Methodology) ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں یورپ میں فرڈی نینڈ ڈی سسیور کے تازہ لسانی افکار سے لسانیات جدید کا آغاز ہوا۔ اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد لسانیات کی ایک اہم شاخ کے طور پر اسلوبیات کا وجود بھی عمل میں آیا۔ اگر چہ ادبی زبان سے ابتدائی دلچسپی روسی ہیئت پسندوں کے ہاں ملتی ہے اور امریکی نئی تنقید میں بھی ایک خاص حد تک زبان سے سروکار پایا جاتا ہے تاہم زبان و اسلوب کے حوالے سے ادب کے باقاعدہ اور منظم مطالعوں اور تجزیوں کی ابتدا لسانیاتِ جدید کے فروغ کے بعد ہی سے ہوتی ہے۔ عہدِ حاضر میں لسانیات کی ایک شاخ کے طور پر اسلوبیات کو جدید تنقیدی نظریات میں ایک اہم مقام حاصل ہے اور ادب کے اسلوبیاتی مطالعے کی روایت اب کافی مستحکم ہو چکی ہے۔

اس امر کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا کہ اسلوبیات اپنی نظری بنیادیں، طریقۂ کار اور اصطلاحات لسانیات سے لیتی ہے۔ اسلوبیاتی تنقید اور ادبی تنقید میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلوبیاتی تنقید معروضی ہے اور ادبی تنقید داخلی نیز اسلوبیاتی تنقید توضیحی ہے اور ادبی تنقید تشریحی۔ اسلوبیاتی تنقید میں اقداری فیصلے نہیں کیے جاتے جب کہ ادبی تنقید کی بنیاد فن پارے کے حسن و قبح کے بیان پر ہے۔ اسلوبیاتی تنقید خالص متن کے مطالعہ پر مبنی ہے، جب کہ ادبی تنقید میں مصنف کی ذات اور اس کے احوال و کوائف کو نیز اس کے عہد .... کو بھی خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

اس نظری پسِ منظر میں اقبال کی نظم ''ایک شام'' کا صوتیاتی تجزیہ،صوتی سطح پر نظم کی اسلوبیاتی قرأت کی خصوصیات کو پوری طرح واضح کردے گا:

ایک شام

(دریائے نیکر (ہائیڈل برگ) کے کنارے پر)

خاموش ہے چاندنی قمر کی	شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش	کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہوگئی ہے	آغوش میں شب کے سوگئی ہے
کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے	نیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تاروں کا خموش کارواں ہے	یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا	قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل! تو بھی خموش ہوجا	آغوش میں غم کو لے کے سوجا

اقبال کی نظم ''ایک شام'' کے اس صوتی تجزیے میں امریکی ماہر اسلوبیات ڈیل ہائمز (Dell Hymes) کے طریقۂ کار کو اختیار کیا گیا ہے جس کا اطلاق اس نے ورڈز ورتھ اور کیٹس کی بعض سانٹس (Sonnets) کے صوتی تجزیوں پر کیا تھا۔ اس تجزیے کی رو سے سب سے پہلے زیرِ تجزیہ نظم کو صوتیاتی رسمِ خط (Phonetic Transcription) میں لکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد نظم میں وقوع پذیر مصمتوں (Consonants) اور مصوتوں (Vovels) کے دو علیحدہ چارٹ بنائے جاتے ہیں اور ان صوتیوں (Phonemes) کے سامنے نظم میں ان کی تعدادِ وقوع لکھی جاتی ہے۔ جب یہ دونوں چارٹ مکمل ہوجاتے ہیں تو ایک تیسرا چارٹ بنایا جاتا ہے جس میں سابقہ دونوں چارٹوں کی کثیر الوقوع (High Ranking) صوتیوں کو درج کیا جاتا ہے اور اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ جس صوتیے کی تعداد سب سے زیادہ ہے اسے سب سے اوپر رکھا جائے۔ اس کے بعد دوسری کثیر الوقوع آواز یا صوتیہ (Phoneme) درج کیا جائے۔ اس طرح تکرارِ وقوع (Frequency of Occurrence) کے لحاظ سے تمام صوتیوں کو تیسرے چارٹ میں درج کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد تیسرے چارٹ پر نظر دوڑائی جاتی ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس میں شامل کون کون سی کثیر الوقوع آوازیں ایسی ہیں جنہیں ترتیب دے کر ایک ایسا لفظ یا فقرہ تشکیل دیا جائے تو زیرِ تجزیہ نظم میں پایا جاتا ہو۔ ایسے لفظ کو جمعی لفظ (Summative Word) کہیں گے جس میں تین خصوصیات کا پایا جانا لازمی ہے:

(۱) یہ لفظ نظم میں کام آنے والی کثیر الوقوع آوازوں (صوتیوں) کی ترتیب سے بنا ہو، یعنی صوتیاتی سطح پر یہ نظم کی کثیر الوقوع آوازوں کا مجموعہ ہو اور پوری نظم کے صوتی آہنگ کو Sum up کرتا ہو۔ اسی لیے اسے

"Summative Word" کہا گیا ہے۔لفظ کے علاوہ یہ کوئی فقرہ بھی ہوسکتا ہے۔

(۲) معنیاتی سطح پر بھی یہ لفظ زیر تجزیہ نظم کے بنیادی خیال یاTheme کو Sun up کرتا ہو۔

(۳) نظم میں یہ لفظ مناسب جگہ پر واقع ہونا چاہیے جس سے نظم کے بنیادی خیال یا مفہوم کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ایسے لفظ کو کلیدی لفظ (Key Word) بھی کہہ سکتے ہیں۔

ایک ذہین قاری شعری متن کی قرأت کے بعد، نظم کے صوتی آہنگ اور آوازوں کے تانے بانے اور ان کی بنت (Texture) سے بخوبی واقف ہوجاتا ہے اسے اس بات کا بھی بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ کون کون سی آوازیں ہیں جو نظم میں بار بار دہرائی جارہی ہیں اور ان آوازوں سے کس قسم کا صوت جمالیاتی (Phono-aesthetic تاثر پیدا ہورہا ہے، نیز نظم کے مجموعی تاثر یا Mood سے اس کی کیا نسبت ہے۔ قاری کے اسی تاثر کو ایک ماہر اسلوبیات یا اسلوبیاتی نقاد ''سائنسی'' بنیاد عطا کرتا ہے۔ سائنسی اس لیے کہ ان تاثرات کو بیان کرنے کے لیے وہ جو طریقۂ کار اختیار کرتا ہے وہ معروضی (Objective) تجزیاتی (Analytical) اور توضیحی (Descriptive) ہوتا ہے۔ یہ تینوں خصوصیات کسی متن کی قرأت کو سائنسی بنیاد عطا کرنے کے لیے کافی ہیں۔

اقبال کی زیر تجزیہ نظم ''ایک شام'' کی قرأت کے بعد جو صوتی نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔مصوتی وقوع (Vowel Occurrences)

☆ آ (طویل مصوتہ) = ۲۵ بار

☆ اَ (مختصر مصوتہ) = ۲۴ بار

☆ او (طویل مصوتہ) = ۲۲ بار

☆ اے (طویل مصوتہ) = ۱۳ بار

۲۔مصمتی وقوع (Consonantal Occurrences)

☆ ش = ۱۶ بار

☆ ک = ۱۶ بار

☆ ہ = ۱۵ بار

☆ م = ۱۴ بار

☆ ر = ۱۴ بار

☆ خ = ۹ بار

☆ س = ۸ بار

مذکورہ تمام مصوتی اور مصمتی آوازیں اس نظم کی کثیر الوقوع آوازیں ہیں۔ ان آوازوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم اس نظم کی دوبارہ قرأت کرتے ہیں تو ہمیں لفظ ''خاموش'' ایک ایسا لفظ ملتا ہے جو صوتیاتی سطح پر نظم کی غالب (کثیر الوقوع) آوازوں سے مل کر بنا ہوتا ہے اور معنیاتی سطح پر یہ نظم کے مفہوم کو Sum up کرتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ نظم میں ایک سے زائد بار استعمال ہوا ہے۔ چوں کہ یہ ڈیل ہائمز کی بیان کردہ تینوں خصوصیات کا حامل ہے، لہٰذا اسے بلا تامل جمعی لفظ (Summative Word) کہہ سکتے ہیں۔

خاموش

ش	و	م	ا	خ
۱۶	۲۲	۱۴	۲۵	۹

لفظ ''خاموش'' میں تین غالب مصمتے (Consonants) شامل ہیں، یعنی /خ/، /م/ اور /ش/ ان میں /ش/۔ ان میں /ش/ کا تکرر (Frequency) سب سے زیادہ ہے۔ دوسرے غالب مصمتے /م/ اور /خ/ ہیں۔ علاوہ ازیں مصوتوں (Vowels) میں /آ/ کا تکرار سب سے زیادہ ہے۔ انہیں پانچوں آوازوں کی ترکیب سے تجمعی لفظ ''خاموش'' کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ اقبال نے فطرت (Nature) کی عکاسی میں اور قدرتی مناظر اور اشیاء میں پائی جانے والی خاموشی، سکوت اور سکون کے بیان میں ان آوازوں سے بہت عمدہ کام لیا ہے۔ نظم کا صوتی تانا بانا ان ہی آوازوں کے اتصال سے تیار ہوا ہے۔ ان آوازوں کی جھنکار پوری نظم میں سنائی دیتی ہے، مثلاً:

خاموش ہے چاندنی قمر کی　　　　شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی

یا

کہسار کے سبز پوش خاموش

یا

تاروں کا خموش کارواں ہے

یا

خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا

نظم کے آخری دو مصرعے بھی، جو حزنیہ کیفیت کو بیان کرتے ہیں، /خ/، /م/ اور /ش/ کی آوازوں کے تانے بانے سے خالی نہیں:

اے دل! تو بھی خموش ہوجا　　　　آغوش میں غم کو لے کے سوجا

شعری متن ''ایک شام'' کی قرأت نظم کے صوت جمالیاتی تاثر کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور ایک ذہین قاری اس کے وجدان سے خاطر خواہ حظ حاصل کرتا ہے، لیکن اس کا معروضی، تجزیاتی اور توضیحی انداز پر بیان لسانیاتی علم کا متقاضی ہے، اور یہ فریضہ اسلوبیات یا اسلوبیاتی تنقید ہی بدرجہ اتم انجام دے سکتی ہے۔

❀❀

Address:

"Areen", Street No.1
386, Iqra Colony, New Sir Syed Nagar
ALIGARH - 202002 (U.P)
INDIA

''دینِ ساحری، دیو مالا اور اسلام''* پر ایک نظر

غلام حسین ساجد

انسانی تہذیب کے ارتقاء کی کیفیت اور سمت کو جاننے کے لیے ساحری، دیو مالا، مذہب اور سائنس کے چار پڑاؤ راہ میں پڑتے ہیں۔ ان سے معاملہ کیے بغیر فکرِ انسانی کی جولانیوں کو سمجھنا ممکن ہے نہ ہی اس کی تحدید کرنا۔ انسانی ذہن کے بچپن، لڑکپن اور سنِ شعور کی جلا کے معاملات سے دلچسپی رکھنے والے دنیا بھر کے دانشور دیو مالا، اساطیر اور علم الآثار سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ کیونکہ بنیاد کی مضبوطی اور استقامت ہی کسی عمارت کے شکوہ اور دوام کی اساس ہوا کرتی ہے اور ماضی کے اسرار کو کھولے بغیر مستقبل کی پیش بینی کرنا دشوار ہوتا ہے۔ عالمی سطح پر اس نوع کے مطالعے کی فہرست بہت طویل ہے اور اسے گنوانا سعی لاحاصل۔ پھر بھی سر جیمس فریزر کی ''شاخِ زریں'' (بارہ جلدیں)، رچرڈ کیمپل کی "A hero with thousand faces" ہنرخ سمر کی "The king and the corpse"، مرسیا ایلیاد کی "Myths, dreams and mystories" ایرخ فرام کی "The foretten language" اور سگمنڈ فرائیڈ کی ''ٹوٹم اینڈ ٹیبوز'' کے تحقیقی اور تشریحی کام سے صرفِ نظر کر کے گزرنا ممکن نہیں اور حالیہ برسوں میں ترجمہ ہونے والی بعض کتابیں جیسے سی۔ جی۔ ایس تھامسن کی ''جادو کی تاریخ'' پال کیرس کی ''شیطان کی تاریخ'' اور کیرن آرم سٹرانگ کی ''خدا کی تاریخ'' بھی خاصے کی چیز ہیں مگر وطنِ عزیز میں اس نوعیت کا کام کرنے والوں کی تعداد اس قدر کم ہے کہ اسے ایک ہاتھ کی انگلیوں پر نہیں، صرف ایک انگلی کی پوروں پر گنا جا سکتا ہے۔ سبطِ حسن (''پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء''، ''ماضی کے مزار'' اور ''موسیٰ سے مارکس تک'') ابن حنیف (''ہزاروں سال پہلے''، بھولی بسری کہانیاں''، ''تخلیقِ کائنات''، دنیا کا قدیم ترین ادب، ''مصر کی قدیم مصوری''، مصر کا قدیم ادب (چار جلدیں) اور ''مار پرستی'' (زیرِ طبع)، علی عباس جلال پوری (رسوم اقوامِ قدیم) اور رحمٰن مذنب (''جادو اور جادو کی رسمیں'' اور دینِ ساحری، دیو مالا اور اسلام) کے علاوہ کوئی اور نام ذہن پر بہت زور دے کر ہی یاد آ سکتا ہے۔ ہاں آپ چاہیں تو آرزو چودھری کی ''دیو مالائی جہان'' اور قدیر شیدائی کی ''دیوتاؤں کی سرزمین'' کو بھی اس زمرے میں شامل کر سکتے ہیں مگر ان میں مستقل تصنیف کا درجہ دو ایک کتابوں ہی کو حاصل ہے۔ زیادہ تر محققین نے دوسری زبانوں خصوصاً جرمن، انگلش اور فرانسیسی میں، ہونے والی تحقیق سے خوشہ چینی کی ہے اور اصل مصنف اور تصنیف کو حوالہ دیے بغیر بصورت ترجمہ اپنی تالیف کا حصہ بنایا ہے۔ امرِ واقعہ یہ

* مصنف : رحمٰن مذنب، ناشر، رحمٰن مذنب، ادبی ٹرسٹ، لاہور

ہے کہ ہماری ادبی اور تہذیبی روایات میں اس موضوع سے اعتنا کرنا اور اساطیر، دیومالا، علم الآثار اور بشریات پر کام کرنا اپنے آپ کو ایک بند گلی میں محصور کرنے کی حماقت کے مترادف ہے۔ رحمٰن مذنب کا استثنیٰ یہ ہے کہ انہوں نے اس بند گلی سے اپنے لیے رم کرنے کو راہ نکالی ہے۔ یہی نہیں اس موضوع سے متعلق اپنی پہلی کتاب ''جادو اور جادو کی رسمیں'' کے دیباچے (تحریر: ۲۷؍اکتوبر ۱۹۵۹ء) سے اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے کہ شاید اس راہ کو اختیار کرنے والوں میں زمانی اعتبار سے ان کو اوّلیت بھی حاصل ہے۔

اس وقت میں چند معروضات ان کی دوسری کتاب ''دینِ ساحری، دیومالا اور اسلام'' کے حوالے سے پیش کرنا چاہتا ہوں، جو غالباً ۱۹۸۷ء میں جا کر مکمل ہوئی اور شاید ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ ''غالباً'' اور ''شاید'' کی یہ بہتات اس لیے کہ اس کتاب کے ''ضابطے'' کے صفحے پر اس کتاب کا سالِ اشاعت درج نہیں مگر مصنف کی شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست میں یہ کتاب چند نئی کتابوں میں سے ایک ہے۔ جس سے یہ گمان غالب آتا ہے کہ یہ کتاب ابھی دو ایک برس پہلے ہی شائع ہوئی ہوگی۔

''دینِ ساحری، دیومالا اور اسلام'' کو جناب رحمٰن مذنب نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلا حصہ ''اسلام اور جادوگری'' دس ابواب'' قبلِ تہذیب کے حیوانی معبود، جادو کیا ہے؟ دنیا کا پہلا جادوگر'' ہندسوں کی جادوگری، جادوگری کے شعبے، معدوم تہذیبی قدر، دنیائے طلسم، جادو، طلسم اور قدیم اوہام، فرعون کی لاش اور اسلام اور دینِ ساحری، پر مشتمل ہے۔ قبلِ تہذیب کے حیوانی معبودوں سے اسلام اور دینِ ساحری تک آتے آتے مصنف ذہنِ انسانی کے ارتقاء کی داستان کو اس خوب صورتی، خوش بیانی اور سہولت سے پیش کرتا ہے کہ ہمارے علمی و ادبی ورثے سے اس طرح کی کوئی اور مثال ڈھونڈ لانا دشوار ہوگا۔ علی عباس جلال پوری کی ''رسوم اقوام قدیم'' بیان کی دلکشی اور تجرِ علمی کی بنیاد پر اس کے مقابلے میں رکھی جاسکتی ہے مگر کسی حد تک کیونکہ جلال پوری صاحب کی زبان قدرے ادق اور دیر آشنا ہے اور رحمٰن مذنب کا اسلوب نسبتاً شگفتہ اور رواں تر۔ کتاب کا دوسرا حصہ ''اسلام اور دیومالا'' ہے اور یہ تین ابواب'' دیومالا کا مطالعہ کیوں؟، یونان کا عہد جاہلیت اور دیومالا کا ارتقاء، اور اسلام اور دیومالا'' پر مشتمل ہے۔ ان دونوں حصوں کے مباحث کا ماحصل ''حرفِ آخر'' ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ جادو یا دینِ ساحری پر حتمی ضرب، صرف اور صرف اسلام نے لگائی ہے۔ اس طرح یہ کتاب ''اسلام'' اور ختم الرسل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی حقانیت کو علمی استدلال کے ذریعے سے بھی ثابت کرتی ہے اور تہذیب انسانی کے ارتقاء کے فطری مدارج کے اپنے عروج پر پہنچنے کے حوالے سے بھی۔ جس سے ہمارے عہد اور ہمارے بعد کے لوگوں کے لیے اس کتاب کی دیرپا افادیت کے سلسلے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

جادو، جسے جناب رحمٰن مذنب نے بجا طور پر ''دینِ ساحری'' کا نام دیا ہے، کا تعلق ماورائے تاریخ سے ہے

مگر یہ تاریخ انسانی کے ارتقاء کا دوسرا قدم ہے۔ ''ٹوٹم'' (جسے میں خیر و برکت کا نشان کہوں تو شاید کچھ زیادہ غلط نہ ہو) کو زمانی لحاظ سے جادو پر فوقیت ہے۔ کیونکہ وہ انسانی ذہن کے بچپن کی ایجاد ہے اور اس کا تعلق ہمیشہ قریب کی سادہ چیزوں سے رہا ہے۔ درخت، پھول، چوپائے، پرندے اور حشرات الارض وغیرہ اور آگے چل کر مافوق الفطرت جانور ''ٹوٹم'' متعین کرنے کے لیے پسندیدہ ترین انتخاب رہے ہیں اور وجہ یہ کہ یہ سب ہی ماورائے تاریخ کے انسانوں کے ارد گرد اور ان کے درمیان موجود تھے۔ ان کے نفع و زیاں یعنی فائدے اور ضرر کی شناخت کرنے کے لیے انہیں ذہن پر زور دینے کی ضرورت تھی نہ اسے استعمال میں لا کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی احتیاج۔ جناب رحمٰن مذنب نے اس کتاب میں اس موضوع پر ہونے والی عالمی تحقیق کو پیشِ نظر رکھ کر بہت معیاری اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ جس کے دوہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ مجھے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جادو یعنی دینِ ساحری، مذہب اور سائنس کی طرف اُٹھنے والا پہلا قدم ہے کیونکہ یہ ذہنِ انسانی میں پیدا ہونے والے تموج اور فکر کے پیچیدہ ہوتے ہوئے دائروں [illegible] تا ہے اور ایک انسان کو دوسرے انسان کی جسمانی اور روحانی آزادی کے سلب کرنے کی راہ پر لا کھڑا کرتا ہے۔ ''ٹوٹم'' نے انسانی ذہن میں جس خوف اور اسرار یعنی ٹیبوز کی بنیاد رکھی تھی۔ جادو اسی خوف اور اسرار کو گھٹا بڑھا کر دوسرے کی طاقت اور کمزوری کو اپنی مطلب براری کے لیے کام میں لانے کی چیز ہے۔ یعنی یہ ایک انسان کی دوسرے انسان کے ذہن پر غالب آنے کی اوّلین کوشش کا نام ہے، جس نے آگے چل کر ایک فکری نظام کی صورت اختیار کی اور موسیقی، رقص، شاعری، نقاشی، بت تراشی ایسے فنونِ لطیفہ کو جنم دیا۔ سحری علاج کے ذیل میں ان گنت تعویذ تیار کیے۔ انسانی اور حیوانی قربانی کی بنیاد رکھی۔ تہواروں، جلوسوں اور عزائی رسموں کی ایجاد کی۔ طب ساحری کو جنم دیا اور مخفی، پُر اسرار اور غیبی قوت ''مانا'' کو قبضۂ قدرت میں لانے کا دعویٰ کر کے قدیم معاشرہ پر اپنی حاکمیت کو مستحکم کیا، بقول رحمٰن مذنب:

''الغرض قدیم معاشرہ پوری طرح جادو کی گرفت میں تھا اور جادوگر نہایت معزز مرعوب کن بلکہ ڈرامائی ہیئت رکھتا تھا۔ علم و فن کا اجارہ دار تھا۔ تہذیب و تمدن کی ترویج اور ترقی کے نت نئے افکار پیدا کرتا تھا۔ دنیا اور آخرت کی زندگی کے لیے رُخ متعین کرتا تھا۔ وہ تخلیقی کام پر ہمہ وقت مامور رہتا۔ ایک جانب تو جسمانی اور روحانی عارضے دور کرتا، دوسری طرف توہمات پھیلاتا۔ یہ شخص بڑی شئے تھا۔ علم و فن کی ساری دولت اپنے قبضے میں رکھتا اور مرنے کے بعد اپنی اولاد یا برادری کے کسی رکن کو سونپ جاتا۔ زمین پرستی، "Cult Fertility" اور فلک پرستی "Solar Mythology" جادوگر کی لونڈی تھی۔ وہی اضافے اور ترمیم و تنسیخ کا مجاز تھا۔ وہ جتنا بڑا فنکار اور جس قدر ہوشیار ہوتا۔ اسی قدر احترام کا مقام اور جاہ و جلال حاصل کرتا۔ وہ اپنے کنبے اور پروہتوں کے گروہ سے باہر کسی کو دینی امور کا منصرم نہ بناتا۔ اس غیر جمہوری نظام نے جاگیرداری اور ملوکیت کو مستحکم کیا۔''

(ص: ۳۶، ۳۷)

رحمٰن مذنب نے یہ نتائج سرسری مطالعے سے اخذ نہیں کیے۔اس کتاب کے حصہ اوّل کے دس ابواب، ان کی وسعت مطالعہ کا ثبوت بھی ہیں اور ان کی فکری سمت کی درستی کے بھی۔ ان ابواب میں کہیں کہیں نتائج اور معلومات کا اعادہ اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مصنف نے یہ ابواب الگ الگ مضامین کی شکل میں طویل وقفوں کے بعد تحریر کیے ہیں اور ان موضوعات پر کام کرتے ہوئے ان کے ذہن میں شاید ترجیحاً کسی مستقل تصنیف کا خاکہ نہیں تھا۔ پھر بھی ان مضامین، ابواب میں تہذیبی سفر کے تسلسل پر عالمانہ نگاہ کرنے کے شواہد موجود ہیں۔ اور رحمٰن مذنب نے ان موضوعات پر ہونے والے علمی کام کے ایک وقیع حصے کو پیشِ نظر رکھ کر ہی انہیں موضوع بحث بنایا ہے۔ جس کا ثبوت ان ابواب کے پاورقی حوالے ہیں۔ انہوں نے ٹوٹم، ٹیبوز اور جادو کے مختلف حصوں اور تہذیبی مرکزوں میں پھیلاؤ اور تسلط کی کیفیت کا احاطہ بھی کیا ہے اور تجزیہ بھی اور اپنی بصیرت اور ادراک کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جادو سے سائنسی انکشافات اور ذات سے کائنات کو تسخیر کرنے کے اس سفر میں انسان کو کامل آزادی صرف اور صرف دینِ اسلام کے ذریعے ہی سے میسر آئی ہے۔ رحمٰن مذنب نے انسانی تہذیب کے اس مطالعے میں جادو یعنی دینِ ساحری کی افادیت سے انکار نہیں کیا کیونکہ علوم وفنون کے ایک بڑے حصے کا آغاز ساحروں ہی کے سحر کدوں سے ہوا ہے مگر پانچ ہزار برس کے تسلط اور فکر انسانی پر غالب رہنے کے باعث، اس کی بیخ کنی لابدی تھی۔ اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے کمزور کرنے اور مٹانے کی بھرپور سعی کی مگر حقیقت یہی ہے کہ دینِ ساحری کا خاتمہ حضور اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد ہی ہوا ہے۔ جب اللہ نے اپنے دین کو مکمل کیا اور ساحری اور کہانت کے سلسلے کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ رحمٰن مذنب کے الفاظ میں:

''اس لفظ کے گراں قدر تہذیبی، ثقافتی اور علمی وفنی سرمایے کے پیشِ نظر میں اسے دینِ ساحری کہتا ہوں۔ اس کی عظمتیں، کارنامے اور فتوحات حیران کن ہیں۔ صدیوں ناقابلِ شکست رہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مزاحمت تو کی لیکن اس کا ڈنکا بجتا ہی رہا۔ آخری ۵۷۱ عیسوی میں وہ آفتاب طلوع ہوا جس نے اسے گہنا دیا۔ اس کے تار و پود بکھیر دیے۔ اگر محمد عربی ﷺ احسان نہ فرماتے۔ حضور اکرم ﷺ کے ذریعے ہمہ گیر معاشرتی تہذیبی اور ثقافتی انقلاب برپا نہ ہوتا تو مخلوقِ خدا جادوگری کی غلام گردشوں میں بھٹکتی پھرتی۔''

(پیش لفظ، ص:۱۳)

''دینِ ساحری، دیومالا اور اسلام'' کے حصہ اوّل کے مباحث چھ ہزار برس کے فکری اور تہذیبی سفر کا احاطہ کرتے ہیں۔ عراق، مصر، یونان، روم اور وادی سندھ کی رسوم، ریت اور فکر کے تجزیاتی مطالعے سے ہمارے لیے جہاں تہذیبی تسلسل کا جاننا آسان ہوتا ہے۔ وہاں الوہی مذاہب کی ضرورت اور اللہ کے فرستادہ نبیوں کے مبعوث ہونے کا جواز بھی سمجھ میں آتا ہے۔ رحمٰن مذنب نے بڑی ژرف نگاہی اور ذہنی کشادگی سے انسانی ذہن کے ارتقاء کو

سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی ہے اور اس کتاب کو صاحب نظر لوگوں کے لیے خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔

کتاب کے اس حصے میں جادو، جادوگری کے شعبے، قدیم اوہام، رسومات، ممنوعات پر عالمانہ مباحث کرتے ہوئے رحمٰن مذنب نے صنمیات، تصوف، یوگ، بھگتی وغیرہ کی ماہیئت کو جاننے اور ان کی حقیقت کو کھولنے کی سعی بھی کی ہے اور انہیں کسی نہ کسی شکل میں ساحری کی تجدیدی کوشش قرار دیا ہے۔ ان کی رائے سے اتفاق یا اختلاف کی بحث میں پڑے بغیر مجھے یہ تسلیم کرنے میں عار نہیں کہ ان کے دلائل اور نتائج کو رد کرنا آسان نہیں۔ اس بنیاد پر وہ ایک صاف ذہن رکھنے والے سچے مسلمان دکھائی دیتے ہیں جو اسلام کی سادگی اور حقانیت کو کسی طرح مجروح ہوتے دیکھنا پسند نہیں کرتے اور اس ضمن میں کسی سمجھوتے کے قائل ہیں نہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

جادو یا دینِ ساحری، دیومالا، اساطیر اور مافوق الفطرت سطح رکھنے والی داستانوں کو ہمارے یہاں خرافات سمجھ کر توجہ کرنے کے لائق نہیں سمجھا جاتا۔ حالاں کہ ان کی ماہیئت اور حقیقت کو جانے بغیر آج کے انسان کے ذہن کو سمجھنا ممکن نہیں۔ علوم وفنون کی بنیاد بننے کے علاوہ یہی خرافات ہمارے مثبت اور منفی رویوں کی اساس بھی ہیں۔ آج کے نفسیاتی اور روحانی عوارض کی جڑیں کہیں نہ کہیں انہی خرافات کے پیٹ میں ہیں اور ان کے کافی وشافی علاج کے لیے ان خرافات کی پرتوں کو کھولنا ہوگا۔ رحمٰن مذنب نے یہ کام ایک سچے عالم کی سطح پر انجام دیا ہے۔ انہوں نے اس کتاب کی تالیف میں دنیا بھر کے ماہرین بشریات، اساطیر، نفسیات دانوں اور تہذیبی فلاسفہ کے کام کو نگاہ میں رکھا ہے اور کسی قسم کے تعصب کے بغیر جادو کے ارتقاء اور اس کے مثبت ومنفی پہلوؤں پر عالمانہ بحث کی ہے۔ اور جگہ جگہ اس ضرورت کا احساس دلایا ہے کہ ماضی اور ماضی کے رہنے والوں کو سمجھے بغیر آج کے انسان کے ذہن کو سمجھنا ممکن نہیں:

"انگریزی میں جادو کا لفظ جس قدر واضح ہے۔ اُردو میں اسی قدر اجنبی ہے۔ ہمارے یہاں گنتی کے چند لوگ ملیں گے، جنہیں اس سے سچا شغف ہو حالاں کہ ہر دانشور کو بالعموم اور عالم دین نیز مبلغِ اسلام کو بالخصوص اس کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہ مطالعہ نہ صرف لابدی بلکہ نہایت دلچسپ علم و دانش سے بھرپور اور فکر انگیز ہے۔ سوشل اینتھرو پولوجی جادو جس کا ایک شعبہ ہے، قطعاً خشک موضوع نہیں۔" (ص: ۱۲، ۱۳)

رحمٰن مذنب نے "دینِ ساحری، دیومالا اور اسلام" میں اس مطالعہ کا حق ادا کیا ہے انہوں نے خالص علمی روّیے کو اپنا کر اور دنیا بھر کے ماہرین علم الآثار کے کام کو بنیاد بنا کر دینِ ساحری کی سب ہی پرتوں کو اپنے قاری کے ذہن پر ایک خاص تاریخی تسلسل اور استدرا کی تجزیے کے باوصف کھولا ہے اور اپنے قاری کی فکر کے دائرے کو تعصب اور کم فہمی سے پاک کر کے وسیع کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ قدیر شیدائی جیسی علمی بے بضاعتی اور ابن حنیف جیسی "مصریاتی مرعوبیت" سے پاک ہیں۔ جناب علی عباس جلال پوری کی طرح ان کا علمی روّیہ بھی خرد

افروزی اور دانش مندی کی روایت کو فروغ دیتے ہوئے اپنے قاری کی درست سمت میں راہنمائی کرنے کا ہے جو ان کی عظمت کی دلیل بھی ہے اور ایک سچے عالم ہونے کا ثبوت بھی۔

کتاب ''دینِ ساحری، دیومالا اور اسلام'' کا دوسرا حصہ دیومالا کے مطالعے کی ضرورت، یونانی عہدِ جاہلیت میں دیومالا کے ارتقاء اور اسلام اور دیومالا کے تقابلی جائزے پر مشتمل ہے۔ ان موضوعات پر عالمانہ بحث کا آغاز کرتے ہوئے مصنف نے اپنے مطالعے کی غرض وغایت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''یہاں عام دیومالا کا تذکرہ بھی ہے اور یونان کی دیومالا کے ارتقاء کا بھی۔ یونان کی دیومالا کے ارتقاء کا بیان بہت کارآمد ہے۔ اس سے پروہتوں، شاعروں، جادوگروں، وڈیروں اور ان کے حواریوں کی چال اور ان کے طریقہ واردات کا پتا چلتا ہے۔ عوام کی گردنیں مارنے کے لیے سیانوں نے تخلیقی صلاحیت کے بل بوتے پر دیومالا کا حربہ گھڑا۔ عوام کے سر پر ہمیشہ تلوار لٹکتی رہی۔ علمی سطح پر دیومالا اور اسلام کا تقابلی مطالعہ کرنے سے ایک کا خودساختہ اور دوسرے کا من جانب اللہ ہونے کا معاملہ واضح ہو جائے گا۔'' (ص:۱۵۷)

اس اقتباس سے جہاں ان کی ذہنی سمت کا اندازہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے، وہیں ان کی فکری کشادگی کی خبر بھی ملتی ہے۔ اسلام کی حقانیت اور بڑائی کا ادراک کرنے اور کرانے کے لیے سب سے بہتر طریقہ جڑوں کی تلاش میں نکلنے کا ہے تاکہ دینِ ساحری، دیومالا، اساطیر اور ان سے جڑے توہمات کو علمی اور عقلی دلائل کے ذریعے رد کیا جاسکے کیوں کہ مرض کی تشخیص کیے بغیر اس کا علاج کرنا ممکن نہیں ہوسکتا۔ ذہن انسانی کی ساخت اس کی جولانیوں اور پیچیدگیوں کو سمجھنے میں دیومالا بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسے جاننا ذہن انسانی کو جاننے کے مترادف ہے اور اس کے کھوج میں نکلنا اپنے مستقبل کو محفوظ کرنے کی ایک صورت۔ فرائیڈ کے قول کے مطابق ''عہدِ قدیم کا انسان دیومالا کی وساطت سے ہمارے لیے قابلِ فہم ہے۔'' رحمٰن مذنب نے اس کتاب میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں:

''دیومالا کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ جب اسلام اور قبلِ اسلام کے ادیان کا تقابلی مطالعہ کریں گے تو حقیقت اور صداقت کی دریافت کے لیے دیومالا کی تخلیقی کارروائی، طرزِ عمل اور تاریخی حیثیت کو ضرور پرکھنا پڑے گا۔ سچ اور جھوٹ کا تب ہی نتارا ہو سکے گا۔'' (ص:۱۵۵)

رحمٰن مذنب نے ''دینِ ساحری، دیومالا اور اسلام'' کے دوسرے حصے میں دیومالا کی اساس اور ترویج پر عالمانہ نگاہ کی ہے۔ خصوصاً باب دوم بعنوان ''یونان کا عہدِ جاہلیت اور دیومالا کا ارتقاء'' ان کی وسعتِ مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کی روشن خیالی اور منہاج کی درستی کا پتا بھی دیتا ہے۔ انہوں نے پروفیسر گلبرٹ مرے، فرائیڈ، ہیکز ہاٹون، لارڈ ریگلن، جمیس فریزر، مس جین ایلین ہیری سن، جمیز پیرن، سر ولیم رجوے، پروفیسر جے سی سٹوبرٹ،

ایڈتھ ہملٹن وغیرہم کی تصانیف کو بنیاد بنا کر دیومالا کے ارتقاء اور پھیلاؤ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس امر کا کھوج لگایا ہے کہ دینِ ساحری کو فروغ اور تحفظ دینے اس کے پنپنے اور طاقتور بنانے میں دیومالا کا کردار کیا رہا ہے اور یہ کس کس طرح فاتحین کی نفسیات کے تابع رہی ہے۔ ان کے الفاظ میں:

''دیومالا کے معاشرتی اثرات نہایت خوفناک تھے۔ اس کے بقا اور اس کے فروغ کی غرض سے وڈیرہ شاہی اور پروہت مت (مذہبی اجارہ داری۔ پریسٹ ہڈ) نے جنم لیا۔ ان دو اداروں کی فرماں روائی کا دور ابھی ختم نہیں ہوا۔ اس نے ہر دور میں عوام کو زیرِ درختی کر کے رکھا۔ غلامی اس کا لازمی نتیجہ ہے۔'' (ص:۱۵۶)

اس طویل مضمون میں رحمٰن مذنب نے دیومالا کے جنم، یونانی دیومالا کے ماخذ، ناگ پوجا، زعیم پرستی یعنی ہیرو پرستی، تثلیث کے معمے اور معروف دیوی دیوتاؤں کے عروج و زوال اور قلب ماہیت کی کتھا کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور ذہن انسانی کے اک اک تار کو الگ کر کے اصل سرچشموں تک پہنچنے کی تگ و دو کی ہے۔ اس مطالعے میں تعصب کا شائبہ تک بھی محسوس نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی خاص نظریے یا اعتماد کی بے وجہ تکذیب کرنے کی کوشش۔ انہوں نے ایک سچے اور متوازن سیج عالم کی طرح اپنے آپ کو علم و فضل کے دھارے پر بہنے کے لیے چھوڑ دیا ہے اور بڑے سلیقے کے ساتھ نتائج نکالنے کی ذمہ داری اپنے قاری کو تفویض کر دی ہے۔ کیوں کہ انہیں یقین ہے کہ ان کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہوئے ان کے قاری کے بھٹکنے کا ڈر نہیں اور ذہن انسانی کو پڑھنے کی اس کوشش کا حتمی نتیجہ وہی ہے، جس کی خبر انہوں نے اس کتاب کے پیش لفظ ہی میں دے دی تھی۔

کتاب مذکور کے حصہ دوم کے باب سوم کا عنوان ''اسلام اور دیومالا'' ہے۔ اس حصے میں رحمٰن مذنب نے دیومالا کے فسخ ہونے اور اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ انہوں نے مصر، یونان اور عرب کے دورِ جاہلیت کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کر کے، دین اسلام کے اختصاص کو عالمانہ انداز میں بڑے سلیقے سے واضح کیا ہے تاکہ قاری کے ذہن میں کسی نوع کی کوئی اُلجھن باقی نہ رہ جائے۔ ذرا دیکھیے تو اپنے اس تجزیاتی مطالعے کی بنیاد پر انہوں نے کیا دلکش نتائج اخذ کیے ہیں:

''ایک دیومالا گئی (کلیۃً نہ سہی جزواً سہی) دوسری دیومالا آگئی۔ دیومالا کا بدل دیومالا ہی تھی۔ یونان ہی نہیں، مصر جو یونانیوں کے لیے علم و دانش کی گراں مایہ اور عظیم الشان درس گاہ تھی اس سے بہت پہلے (اور کم و بیش پانچ ہزار برس تک) زبردست تغیر و تبدل کی آماجگاہ بنی۔ اسلام وہ سچا دین ہے، جس نے دیومالا کا شیرازہ بکھیر دیا۔ دیومالا کو مٹایا تو دنیا کو وہ دین دیا جو من گھڑت تھا نہ استحصال کا ذریعہ، نہ کسی کی ذاتی غرض کا پابند۔ ہر نوع کے توہمات، مفروضات، قیادات اور تعصبات سے یکسر مبرا تھا۔ یہ تو ایک دائمی سدا بہار نغمہ تھا اس نے حسن و جمال کا ایسا دریا بہایا، جس سے مخلوقِ خدا نے غسل صحت بھی کیا اور اس سے شفائے کامل بھی پائی۔'' (ص:۴۳۶)

اس طرح کتاب "دینِ ساحری، دیو مالا اور اسلام" اس مقصد سے ہمکنار ہوتی ہے جو اس کی تالیف کی اصل غایت ہے۔ دین اسلام کی حقانیت کو جاننے اور ثابت کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ ہو بھی نہیں سکتا۔ جناب رحمٰن مذنب نے بالکل درست سمت میں قدم اُٹھایا ہے اور اس عمل کی جس قدر پیروی ہو سکے، کی جانی چاہیے۔

رحمٰن مذنب آج ہمارے درمیان موجود نہیں۔ افسوس سوشل اینتھرولولوجی کو موضوع بنانے والے سب ہی عالم (سبط حسن، ابن حنیف، علی عباس جلالپوری، آروز چودھری، قدیر شیدائی، سیّد محمد تقی) ہمارے درمیان سے اُٹھ چکے۔ اس وقت کم از کم پاکستان میں ان موضوعات سے دلچسپی رکھنے والا کوئی زندہ شخص میرے علم میں نہیں۔ آج اس تعزیتی ریفرنس سے باہر نکل کر اگر کوئی صاحب علم و دانش اس موضوع سے رجوع کر لے تو شاید ہماری گم شدہ میراث کی بازیافت اور تحفظ کا یہ سلسلہ جاری رہے۔ مجھے یقین ہے، رحمٰن مذنب کے دریافت کردہ خرد افروزی کے اس منہاج کو اپنانے والوں کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ کیوں کہ سچ اور خیر کی جانب جانے والے راستے کبھی بند نہیں ہوا کرتے۔

❀❀

Address:
280 Raza Block
Allama Iqbal Town
Lahore : 54570

عادؔل منصوری : انوکھا شخص انوکھا شاعر

شاہین

عادؔل منصوری عصرِ حاضر کے جدید شاعروں میں نمایاں اور منفرد مقام، رکھتے ہیں۔ ان کا اپنا مزاج ہے۔ اپنی زبان اور لفظیات کے سہارے وہ انوکھی شعری دنیا کی تخلیق کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ ہم لمحاتی گرفت سے کٹتے نظر آتے ہیں۔ نظم ہو یا غزل دونوں پر ان کی چھاپ واضح ہے۔ حتیٰ کہ ترجمے کے لیے انہوں نے جن نظموں کا انتخاب کیا ہے ان سے بھی ان کے شعری اثبات کا پیکر بتدریج اُبھرتا نظر آتا ہے۔

ترقی پسندی، جدیدیت، یا مابعد جدیدیت کسی شاعر کے مطالعے کے ضمن میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ شاعر کے تخلیق نظام سے اس کے فکر و فن کا براہِ راست تعلق ہوتا ہے۔ ہر اچھا شاعر اپنے طور پر اپنی راہ متعین کرتا ہے۔ چنانچہ عادل منصوری کی شاعری میں انسانیت کے درد میں دھڑکتے دل کے زیر و بم کا آہنگ بھی ہے۔ مقامیت سے آفاقیت تک کی تگ و دو کی گردِ مسافت بھی ہے اور جدید تر طرزِ بیان کا موضوع کی مناسبت سے دل آویز شگفتگی کے ساتھ کچھ کھردراپن بھی ہے۔ دیکھا جائے تو دہائیوں کے اعتبار سے ادب کی تقسیم بھی ایک مصنوعی عمل ہے۔ عادل منصوری کی شاعری کا آغاز اگر آج، اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں بھی ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ جب بھی ان کی شاعری اپنے رنگ میں منفرد ہوتی۔

عادل منصوری سے میرا تعارف پہلی بار ایک نظم کے ذریعے ہوا جو کسی رسالے میں شائع ہوئی تھی اور ان کے مجموعے ''حشر کی صبح درخشاں ہو'' میں شامل ہے۔

یہود یوکان یوش یکرش
یساق یغمایلم یلملم
ہمیغ ہمدہ ہمزہ ہمانا
ہماس ہم خواب ہاتھ آئے
در یدو رخ وحید واقد
نیاح نوشہ نمام غلہ
مال مانح متاب منی
متکا مجتاز رخ مجصص
لبان لبنان لبس لاہوت

لبق لبیک لت لجاجت

لہو سے اٹھتا دھواں تو دیکھو (یہودیو کان یوش یکرش)

اس نظم میں آخری بے حد خوب صورت مصرعے کے علاوہ کہیں اور اُردو کا کوئی مکمل ٹکڑا نہیں۔ مجھے احساس ہوا کہ شاعر نظم کو تو یقیناً ہے لیکن ان کے قارئین کا حلقہ ہم جیسے کم سوادوں سے الگ ہے۔ یہ بڑی اونچی باتیں ہیں۔ شاید یہ رنگ حسن شہیر اور افتخار جالب کے رنگ سے بھی زیادہ ''چوکھا'' ہے۔ بہت دنوں بعد عادل منصوری کی ایک نسبتاً طویل نظم پڑھنے کا اتفاق ہوا جس کا ایک اقتباس درجِ ذیل ہے:

بے گناہی میں مرا نامۂ اعمال دلیل

میں ترے روبرو خود اپنی ہی نظروں میں ذلیل

مرحبا! تیری عدالت کہ گواہی نہ وکیل

رات سڑکوں پہ لگائے ہوئے خوابوں کی سبیل

ایک معصوم بدن اپنی ہی خواہش کا قتیل (وقت کی ریت پہ)

اسی نظم کے کچھ دوسرے مصرعے یوں ہیں:

ہڈیاں خواب کے کتوں نے چبائیں شب بھر

......چاند پستان کبھی دودھ پیالہ چھلکے

......کھو کھلے جسم کی زینت ہے گدھے کی آواز

......چائے کی پیالی میں تحلیل ہے بوسوں کا ہجوم

......بھینس دلدل میں اُتر جائے تو تمثیل بنے

بکریاں سامنے میدان میں ابلاغ زدہ

اگر اس پوری نظم کو غور سے پڑھیں تو یہ اپنے انوکھے پن کے سبب بہت دلکش نظر آتی ہے۔

خمیازہ بھگتنے کی سلاخیں چاٹنا، زنجیر کے حلقوں میں سمندر باندھنا، لفظوں کے مزاروں پہ نئے پھول رکھنا، ابرہہ کا کعبے کی دیوار کے سائے میں جلنا، جلاوطنی کی تلوار سے سانسوں کا گھائل ہونا، سبز اندھیروں میں برہنہ چلنا، وقت کے ہاتھ کا بڑھ کر مرغ کی کلغی نوچنا، جسم کا ابلے ہوئے انڈوں سے حرارت پانا، یہ لفظیات اور ایسی پیکر تراشیاں راں بوکی سی خلاقی سے بھی آگے کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ان کے ہاں کہیں کہیں غیر مانوس الفاظ کی نغمگی کے تسلسل کے بعد اچانک کسی نوکیلے پتھر کی سی گہری چوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ یہ فن کتنوں کو آتا ہے؟ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ شاعر کے پاس کہنے کو اتنا کچھ ہے کہ وہ کم وقت میں اپنی ساری باتیں محسوسات کی رو کے تحت کہہ ڈالتا ہے۔ اب یہ قاری کا کام ہے کہ وہ اُلجھے ہوئے سروں کو مربوط انداز میں

دیکھیے۔ قاری کی مشکل یہ ہے کہ نظم میں موجود پیکروں کے اتنے ہجوم ہیں کہ اس کا ذہن مختلف سمتوں میں بھٹکتا ہے اور وہ معنی کی تلاش کرتے ہوئے مرکز گریز مناہیم میں سرگرداں بھول بھلیوں کا شکار اپنے آپ کو بے بس گردانتا ہے۔ کچھ اور مثالیں دیکھیے:

زوال سبزے پہ رینگتا ہو تو
لوگ سایوں کی سیڑھیوں پر
سفید بیلوں کے سینگ میں خواب دیکھتے ہیں

......

ہمارے کندھوں پہ چاند سورج کا بوجھ
صدیوں کا شائبہ ہے تو بکریاں کیوں خریدتے ہو (زمین سر سے بندھی ہوئی ہے)
لہو سبز سیلاب آوا گمن
ظفر جامنی تیرگی تالیاں
کھرچتے ہیں خوابوں کو ناخن نظر
مگر مفلسی
رائیگاں رتجگو میں رطوبت طرب (لہو سبز سیلاب آوا گمن)

اپنی مشکل پسندی کے باوجود عادل منصوری اپنی نظموں میں تخلیقی لو کو ہمیشہ اونچا اور درخشاں رکھتے ہیں۔ ان کی لفظیات کی ایک فہرست مرتب کی جائے تو وہ اپنے طور پر بالکل الگ نظر آئے گی۔ ان کی نظموں میں موضوعاتی اعتبار سے بڑا تنوع ہے۔ جس خطۂ ارض اور جس قسم کے رنگا رنگ ماحول میں ان کی بود و باش ہے اس کی جھلکیاں ان کی شاعری میں بھی ملتی ہیں۔ بیکٹ کا ڈراما ''گودو کا انتظار''، کولڈ کافی کی تہوں میں جمی ہوئی کوالٹی کی نیم عریاں شام کی پیلی اداسی، کم سپٹمبر کی دھن، سیٹی لائٹ بکس (کتابوں کی دکان)، بیٹ نسل کا شاعر ایلن گنس برگ، اداکار مارلن برانڈو، اور اس قبیل کے دوسرے حوالے ان کی شاعری کو پڑھتے ہوئے توجہ چاہتے ہیں۔

اُردو کے علاوہ عربی، فارسی، پنجابی، اور ہندی الفاظ کا خلاقانہ استعمال ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی وضع کردہ ترکیبیں بھی انوکھی ہیں۔ ان کی کئی نظمیں ایسی ہیں کہ اگر انہیں دیوناگری رسم الخط میں لکھ دیا جائے تو کسی لفظ کو ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ مثلاً ایک نظم ''ویدنا کو کس طرح آکار دو گے''، ملاحظہ فرمائیے۔

ویدنا کو کس طرح آکار دو گے
کالی گھٹناؤں کی کڑوی شونیتا کو
کس طرح دھتکار دو گے؟

تم ستاروں کے پجاری
سوریہ پر وشواس کیسے رکھ سکو گے؟
سوریہ تو ساکچھات اگنی
گھومتا ہے میری رگ رگ میں لہو بن (کر؟)
تم کشتج کے ٹوٹنے کی کیوں پرتکشا کر رہے ہو؟
ہو سکے تو یوں بکھر جانے سے پہلے
اپنا استی تو بچالو
وِبنھ سے دامن چھڑالو

اب گیت کے آہنگ سے مطابقت رکھتی ہوئی ایک مختصر سی خوب صورت نظم بھی دیکھتے چلیں:

شعلوں میں ڈوب گئی شام
سورج کی آنکھوں میں ڈولتی اداسیاں
تنہائی رہ رہ کے لہراتی درمیاں
پھیل رہے یادوں کے دام
شعلوں میں ڈوب گئی شام
خوابوں کے پھیلتے سائے جھلس گئے
معنی کی دلدل میں الفاظ دھنس گئے
جل بجھ کے راکھ ہوئے نام
شعلوں میں ڈوب گئی شام (شعلوں میں ڈوب گئی شام)

عادل منصوری جدید گجراتی ادب کے اکابرین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی کتاب ''حشر کی صبح درخشاں ہو'' میں ان کی اپنی ایک گجراتی نظم کا اُردو ترجمہ بھی شامل ہے۔ وہ انٹرنیٹ پر ایک گجراتی رسالہ بھی ترتیب دیتے ہیں جس میں اس زبان کے سرکردہ شاعروں کی تخلیقات شامل ہوتی ہیں۔

عادل منصوری کی غزل کا پہلا شعر جو میں نے کسی مضمون میں بطور حوالہ پڑھا تھا ان کے شعری مزاج کی توسیع کرتا نظر آیا:

تو کس کے کمرے میں تھی — میں تیرے کمرے میں تھا

پھر:

تے کے اوپر دو نقطے — بے کے نیچے ایک نقطہ
وہ نقطہ جو تھا بے کے نیچے ابھی — بے کے نیچے اک نقطہ
اس نے یہ کہلایا ہے — تم مجھ سے شادی کرلو
گھر میں بھی سب راضی ہیں — دل کہتا ہے ''ہاں کہہ دو''
عادل اب شادی کرلو — ستائیسواں ختم ہوا
کل وہ عادل سے یہ فرماتے تھے — شاعری چھوڑ کے شادی کرلو
کون اب شعر کہے نظم لکھے — شہر ہی چھوڑ گئی جب زیبو

یا:

میاں کرتے رہو جو جی میں آئے — بڑے بوڑھوں کی باتوں پر نہ جاؤ

یہ ان کی غزل کا ایک رنگ ضرور ہے لیکن غالب رنگ نہیں۔

اوکاڑہ (پاکستان) کے ظفر اقبال نے جدید اُردو غزل کو ایک الگ شناخت دی ہے۔ ان کے کچھ معاصرین ان کی مخالفت میں اتنے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ وہ غیر شعوری طور پر اپنی شاعری میں ظفر اقبال کو ہی برتنے لگتے ہیں جو آسان کام نہیں۔ (عجب بدحال ہوتے جا رہے ہیں/ظفر اقبال کو رد کرنے والے/ظفر اقبال ہوتے جا رہے ہیں)۔ اُردو زبان کے لفظوں کو توڑ پھوڑ کر، کہیں پنجابی محاوروں کا قلم لگا کر، اور نت نئی، اچھوتی ردیفوں سے غزلوں کو آراستہ کرنے کے بعد اپنے زورِ تخیل کی جولانیاں دکھاتے ہوئے وہ ایسے جہانِ نو کی بنیاد ڈالنے میں کامیاب ہوئے ہیں، جہاں روایتی دروبست کے ساتھ ساتھ جدت طرازی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ ساقی فاروقی ظفر اقبال کی ایک چوتھائی شاعری کے ''جی جان سے قائل'' ہیں لیکن بقیہ حصے کے بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھنے میں ہی عافیت جانتے ہیں۔ لیکن ظفر اقبال نے کم کے اعتبار سے اتنا کچھ اردو غزل کو دیا ہے کہ ان کی پچیس فی صد شاعری بھی ایک گراں قدر اضافہ ہی قرار پائے گی۔ بہر نوع، ساقی فاروقی ساقی فاروقی ہیں۔ ان کی شاعری ہی نہیں نثر بھی خواہ کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو چیخ چیخ کر اعلان کرتی ہے کہ یہ تحریر کسی اور کے قلم کی مرہونِ منت ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ان کے اتنے کہے کو بہت جانیے کہ ان کی نوازشات کی ''ہمہ عالم'' کو خبر ہے۔

عادل منصوری نے اپنے شعروں میں ظفر اقبال کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

اوکاڑہ اتنی دور نہ ہوتا تو ایک دن — بھرلاتے سانس سانس میں گل آفتاب کے
رنگوں کی سرخ ناف دا کھلیا گلا آفتاب — اندھی ہوائیں (؟) خار کھڑک کان بھر گئی

ایک غزل کے مقطعے میں عادل منصوری نے آواز لگائی:

عادل کے پکاریے تعمیر کے لیے — پتھر اکھڑ گیا ہے غزل کے مزار کا

ظفر اقبال نے جواباً لکھا:

عادل کو اب بلائیں مرمت کے واسطے　　　پتھر اکھڑ گیا ہے غزل کے مزار کا

غرض یہ سلسلہ خاصا دراز ہے۔

عادل منصوری کی بعض غزلوں کی ردیفیں ملاحظہ کیجیے۔

کمینے کتے/ الف/ نون میں/ لام کا/ بڑی شین/ ہوا سا ہو

گھورتا کیا ہے کمینے کتے　　　سونگھتا کیا ہے کمینے کتے

لگی ہے تو بستی کو جل جانے دو　　　مگر ہو سکے تو بچا لو الف

الف سیر کرنے گیا نون میں　　　ملے میم کے نقشِ پا نون میں

ہے گلی میں آخری گھر لام کا　　　تیسواں آتا ہے نمبر لام کا

خواہش کی خنک خندقیں گہرائی بڑی شین　　　لذت کا لہو سونگھ کے لہرائی بڑی شین

گر داد تو نہ دے نہ سہی گالیاں سہی　　　اپنا بھی کوئی عیب ہنر تا ہوا سا ہو

اب ذرا کچھ اور اشعار دیکھیں۔ حیرانی ہوگی کہ یہ شاعر کہاں سے آن ٹپکا:

یک قطرہ اشک کا چھلکا تو دریا کر دیا　　　ایک مشتِ خاک جو بکھری تو صحرا کر دیا

وارداتِ قلب لکھی ہم نے فرضی نام سے　　　اور ہاتھوں ہاتھ اس کو خود ہی لے جا کر دیا

باہر گلی میں شور ہے برسات کا، سنو　　　کنڈی لگا کے آج تو گھر میں پڑے رہو

آنگن میں تیری یاد کا جھونکا جو آگیا　　　تنہائی کے درخت سے پتے اڑا گیا

پھر بالوں میں رات ہوئی　　　پھر ہاتھوں میں چاند کھلا

آؤ جہاں سے جی چاہے　　　شہر کے بارہ دروازے

اب وہ شعلہ کہیں ملے تو اسے　　　بند ہونٹوں کے درمیاں رکھ لوں

میں اس گلی سے سر کو جھکائے گزر گیا　　　چلغوزے پھینکتی رہی مجھ پر وہ بام سے

حمام کے آئینے میں شب ڈوب رہی تھی　　　سگریٹ سے نئے دن کا دھواں پھیل رہا تھا

بگڑے ہوئے جہان کی صورت سنور گئی　　　بچوں کی دور بین بڑا کام کر گئی

آخرِ شب سب ستارے سو رہے ہیں بے خبر　　　کوئی سورج کو خبر کر دو کہ اب شب خون مار

جو چپ چاپ رہتی تھی دیوار پر　　　وہ تصویر باتیں بنانے لگی

کوئی بھی شخص ان اشعار کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ شاعر شعر میں تجربوں کا دلدادہ ہے، اسے تازہ کاری کی للک ہے، کبھی ہموار سطح پر فاصلے کی کمی بیشی کے ساتھ، کبھی بلندیوں پر زاویے بدل بدل کر وہ

نئے پیکروں کی تخلیق کرتا ہے اور پھر ان میں اپنی آنکھوں کی قوس قزح کے رنگ بھی شامل کر دیتا ہے۔ وہ حقیقت کو مسخ نہیں کرتا بلکہ ان ابعاد کو ڈھونڈ نکالتا ہے، جن سے حقیقت اپنی ارفع ترین شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اب سے بارہ سال قبل (۱۹۹۶ء میں) شمس الرحمٰن فاروقی نے انہیں جدیدیت کے علمبردار شعراء کی صفِ اول میں شمار کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ "عادل منصوری کو ہمارے زمانے کا سب سے زیادہ تازہ کار اور سب سے زیادہ مُہم جو اور باہمت شاعر کہا جا سکتا ہے۔" جہاں وہ تازہ کاری کے ہنر سے واقف ہیں وہیں انہیں اس بات کا احساس بھی ہے کہ مُہم جوئی میں لاحق خطرات سے ہمت کے ساتھ ہی نبرد آزمائی کی جا سکتی ہے۔ روایت شکنی سے نئی روایات کی تشکیل تک کے مراحل صبر آزما بھی ہوتے ہیں۔ عادل منصوری کی شاعری کا مبسوط جائزہ لینا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ یہ کارنامہ نقادانِ گرامی ہی انجام دے سکتے ہیں۔ میں تو ادب کا ایک معمولی قاری ہوں۔ تاہم مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ عادل منصوری کا اپنا رنگ اور چوکھا ہوتا جا رہا ہے۔

❁❁

Address:
1328 Potter Drive
Manatick Ontario
K4M 1C6 (Canada)

بیسویں صدی کے اُردو افسانوں پر دیومالا کے اثرات

الیاس شوقی

مغربی ادب کے زیر اثر اُردو افسانے کا آغاز ہی بیسویں صدی میں ہوا ہے۔ گو کہ ابتدا میں رومانی اور اصلاحی دونوں طرح کے افسانے لکھے گئے لیکن بہت جلد اصلاحی افسانوں نے رواج پالیا۔ اس کی خاص وجہ اس زمانے کے حالات تھے جس کا تقاضہ تھا کہ ایک مقصد کے تحت ادب تخلیق کیا جائے۔ ادب برائے ادب کا رجحان ختم ہو رہا تھا۔ اصلاحی ادب کے لیے ضروری تھا کہ صحت مند سابقہ روایات کو مثال بنا کے لوگوں کے سامنے پیش کیا جاسکے تا کہ اس سے اصلاحی پہلو واضح اور مؤثر ہو جائے۔ چوں کہ دیو مالا یا اساطیر میں بھی اس طرح کے اوصاف پائے جاتے ہیں اس لیے ہمیں ابتدا سے اردو افسانے میں دیومالا کا ذکر کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ خود پریم چند نے غیر شعوری طور پر اپنے بعض افسانوں میں دیومالا کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً افسانہ ''بدنصیب ماں'' میں پنڈت ایودھیاناتھ کی موت کے بعد جب پھول متی کے بیٹے اسے باپ کی جائیداد سے بے دخل کر دیتے ہیں تو وہ کہتی ہے:

پھول متی نے پوچھا: ''کس نے بنایا ہے ایسا قانون؟''

اُما: ''ہمارے رشیوں نے مہاراج منو نے اور کس نے؟''

پھول متی ایک لمحہ خاموش رہ کر بولی: ''تو میں اس گھر میں تمہارے ٹکڑوں پر پڑی ہوئی ہوں۔''

اُما: ''تم جیسا سمجھو۔''

پھول متی: ''گھر میں نے بنوایا ہے۔ روپے میں نے جوڑے، باغ میں نے خریدا، آج اس گھر میں میں غیر ہوں؟ منو نے یہی قانون بنایا ہے؟''

سماج میں دھرم اور بھگوان کے نام پر جو ناانصافیاں ہوتی ہیں پریم چند نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہم اسے یا اس طرح کی دوسری مثالوں کو دیومالا کے اثرات نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ اس کا صحیح استعمال کرتے ہوئے معنوی فائدہ تو جدید دور کے افسانہ نگاروں نے اٹھایا ہے۔ حالاں کہ اساطیر کا استعمال ترقی پسند تحریک کے زمانے میں ہی شروع ہو چکا تھا جس کا ذکر آگے آئے گا، لیکن ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اپنے زمانے میں ان سے کوئی خاص کام لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ ترقی پسندی میں ان باتوں کو ماضی پرستی سے تعبیر کیا جاتا تھا جو مستقبل کے خواب اور انقلابی سوچ کے لیے مضر تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ پریم چند اور ان کے فوراً بعد مغربی فکر و نظریات سے اُردو افسانہ بوجھل ہونے لگا۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز کے ساتھ ہی سماجی تبدیلی کی خواہش شدید تر ہو گئی اور اس کے حصول کے لیے مغرب کی اتباع کو اپنا محور بنایا گیا۔ حقیقت نگاری کے نام پر خارجی مسائل

اور مادّی آسودگیوں کی اہمیت مقدم ہوگئی۔ نظریہ زندگی پر حاوی ہوگیا۔ اس نے جذباتیت اور رومانیت کے سہارے افسانے میں دلچسپی کے عنصر کو تو باقی رکھا لیکن آدمی کی ذات کو دولخت کر دیا اور وہ روحانیت سے دور ہونے لگا۔ چوں کہ مارکسزم نے مذہب کی تردید کی تھی اس لیے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا ہی تھا۔ انتظار حسین نے ''علامتوں کا زوال'' میں اس پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''حقیقت نگاری کے مسلک کا تقاضہ یہ ہے کہ خارجی حقیقتوں کو ان کے واقعی اور اصلی رنگ میں پیش کیا جائے۔ اُردو کے حقیقت نگار یہ ہمت پیدا نہ کر سکے۔ لکھنے والے نے حقیقت نگاری کے جوش میں باطنی زندگی کے سفر سے منہ موڑ لیا اور خارجی حقیقت کو براہِ راست دیکھنے کی اس میں تاب نہ تھی۔ اس نے اس سے کترا کر جذباتیت میں پناہ لی۔ جذباتیت حقیقت نگاری کی مابعد الطبیعات ہے۔ حقیقت نگار جب حقیقت سے گریز کرتے ہیں تو جذباتیت میں پناہ لیتے ہیں۔''

چوں کہ اُردو ایک مشترکہ تہذیب کی زبان ہے اس لیے اس میں کئی زبانوں کے ملے جلے اثرات ملتے ہیں۔ خاص طور پر فارسی، عربی اور ہندی کے۔ ان کی آمیزش نے زبان میں ایک عجیب جاذبیت اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔ ان میں بھی سب سے زیادہ اثرات ہندی کے ہی ہیں۔ چوں کہ اُردو زبان کا خمیر اسی سرزمین کی مٹی سے اُٹھا ہے اس لیے اس کی بو باس اس میں پوری طرح رچی بسی ہے اور اس زمین کی ثقافت سے اس کی جڑوں کا پیوست ہونا ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اُردو زبان میں ہندوستانی کہاوتوں اور محاوروں کے ساتھ قدیم ہندوستانی روایات کے عکس بھی نظر آتے ہیں۔ یہ روایات ہندوستانی تہذیب میں دیومالا کی شکل میں زمانہ قدیم سے موجود ہیں۔ قوموں کی تاریخ میں دیومالا کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ انسان کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور داخلی تقاضوں کی بہت عمدہ چلتی پھرتی تصویریں ہمیں ان میں نظر آتی ہیں۔ آدمی نے جب سے سوچنا شروع کیا اور تہذیب کی آرائش و ترتیب کے سلسلے کا آغاز ہوا، زندگی اس کے لیے کسی معمہ سے کم نہیں رہی۔ ایک طرف وہ اشرف المخلوقات کہلاتا ہے تو دوسری طرف اس زمین کی سب سے زیادہ دُکھوں اور تکلیف میں گھری مخلوق بھی وہی ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ ان دُکھوں کی پیدائش کا سبب بھی وہ خود ہی ہے۔ ان سے نجات کے لیے وہ ہمیشہ سے نبرد آزما رہا ہے لیکن چھٹکارے کی صورت آج تک نظر نہیں آتی۔ جدید اُردو افسانے کے سر اگر یہ تہمت ہے کہ اس نے علامت نگاری کے نام پر لایعنی اور مبہم افسانوں کو رواج دیا تو دوسری طرف اسے یہ کریڈٹ بھی جاتا ہے کہ اسی زمانے میں بہت سے افسانہ نگاروں نے علامت کے ساتھ دیومالا کا بھی استعمال کر کے اسے اپنے عہد سے جوڑتے ہوئے ایک نئی معنویت دینے کی کوشش کی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی، سریندر پرکاش اور انتظار حسین اُردو کے سب سے پہلے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں میں اساطیر کا استعمال ایک نئی معنوی ترسیل کے لیے کیا۔ یہاں میرا مقصد چوں کہ فہرست سازی نہیں ہے اس لیے چند کے ذکر سے اپنی بات پیش کروں گا۔

میرا قیاس ہے کہ دیومالا کا بامعنی استعمال سب سے پہلے غالباً بیدی نے کیا ہے ان کا افسانہ ''گرہن'' پہلی بار کب اور کس رسالے میں شائع ہوا تھا یہ تو پتہ نہیں، لیکن ان کا مجموعہ ''گرہن'' ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا جس میں یہ افسانہ شامل ہے۔[1] اس میں بیدی نے ہندوستانی دیومالا کا پہلی بار بہت عمدہ استعمال کیا ہے۔ بیدی کے یہاں افسانے کی کرافٹنگ میں چوں کہ انسانی نفسیات کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اس لیے ان کے افسانوں میں اساطیری کرداروں کے حوالے سے انسان کی بے بسی اور اس کی نفسیاتی اُلجھنوں کو زیادہ موضوع بنایا گیا ہے۔ انہوں نے اس کی مدد سے اپنے افسانوں میں معنوی سطح پر وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاید اسی لیے بیدی نے براہِ راست کسی اسطور کو بنیاد بنا کے افسانہ نہیں لکھا جیسا کہ انتظار حسین اور سریندر پرکاش کے یہاں ہمیں افسانے ملتے ہیں۔ بیدی نے دیومالائی واقعات یا کرداروں کی مدد سے اپنے افسانوں میں رنگ آمیزی ضرور کی ہے۔ اس سے ان کے افسانوں کی معنویت زیادہ گہری اور پُر اثر ہوگئی ہے۔ یہ بیدی کا آرٹ ہے۔ چاہے وہ افسانہ ''اپنے دُکھ مجھے دے دو'' کی اندو ہو یا ''گرہن'' کی ہولی۔ دونوں افسانوں میں دیومالا ایک ذیلی قصّے کے طور پر جاری رہتی ہے اور افسانے کے واقعات کی اثر آفرینی میں اضافہ کرتی ہے۔ ''گرہن'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں بیدی نے افسانے کی بنت میں اسطور سے کس طرح فائدہ اُٹھایا ہے:

''سمندر کی ایک بڑی بھاری اچھال آئی۔ سب پھول، بتاشے، آم کی ٹہنیاں، گجرے اور جلتا ہوا مشک کافور بہالے گئی۔ اس کے ساتھ ہی انسان کے مہیب ترین گناہ بھی لیتی گئی۔ دور بہت دور ایک نامعلوم، ناقابلِ عبور، ناقابلِ پیمائش سمندر کی طرف...... جہاں تاریکی ہی تاریکی تھی...... پھر شنکھ بجنے لگے۔ اس وقت سرائے میں سے کوئی عورت نکل کر بھاگی۔ سرپٹ، بگٹٹ...... وہ گرتی تھی، بھاگتی تھی، پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتی، ہانپتی اور دوڑنے لگتی ...... اس وقت آسمان پر چاند پورا گہنا چکا تھا۔ راہو اور کیتو نے جی بھر کر قرضہ وصول کیا تھا......''

ہولی جو ایک عام عورت ہے۔ سماج میں اس کا استحصال جس طرح ہر سطح پر ہوتا ہے اس کی تصویر کشی بڑی دردناک ہے۔ نہ صرف شوہر اور سسرال والوں کی زیادتیوں نے اس کی زندگی کو گہنا دیا ہے بلکہ اس گرہن سے نجات حاصل کرنے کے لیے جب وہ گھر سے بھاگ کر اپنے میکے کی طرف جاتی ہے تو وہاں بھی ہوس کے پجاری اس کی عصمت کے درپے ملتے ہیں۔ اس ساری کیفیت کو بیدی نے نہایت خوب صورتی سے اس ایک جملے میں بیان کر دیا ہے: ''اس وقت آسمان پر چاند پورا گہنا چکا تھا۔ راہو اور کیتو نے جی بھر کر قرضہ وصول کیا تھا۔'' گوپی چند نارنگ نے ''گرہن'' کا تجزیہ کرتے ہوئے بہت خوب صورت بات کہی ہے:

''وہ کہانی جس میں بیدی نے استعاراتی انداز کو پہلی بار پوری طرح استعمال کیا ہے اور اساطیر فضا اُبھار کر پلاٹ کو اس کے ساتھ ساتھ تعمیر کیا ہے ''گرہن'' ہے۔ اس میں ایک گرہن تو چاند کا ہے اور دوسرا گرہن اس زمینی

---

[1] بیدی نامہ: شمس الحق عثمانی، اشاعت: دوم، مطبوعہ ۲۰۰۷ء، ص: ۸۴

چاند کا ہے جسے عرفِ عام میں عورت کہتے ہیں اور جسے مرد اپنی خود غرضی اور ہوسناکی کی وجہ سے ہمیشہ گہنانے کے درپے رہتا ہے۔''

بیدی کو انسانی نفسیات کی اُلجھنوں اور گرہوں کو کھولنے میں خاص مہارت حاصل ہے۔ ہمارے سماج میں عورت، بچہ اور بوڑھا ایسے کردار ہیں جو اپنے جسمانی کمزوری کے باعث سب سے زیادہ استحصال کا شکار ہوتے ہیں اور اسی لیے وہ نفسیاتی اُلجھنوں میں گھرے رہتے ہیں۔ بیدی کے بیشتر افسانوں کے یہی اہم کردار ہیں اور ان کی نفسیاتی اُلجھوں کی گرہیں کھولنا ان کا خاص موضوع رہا ہے۔ انہیں کرداروں کو موضوع بنا کے انہوں نے اپنے افسانوں کی تعمیر کی ہے۔ بعض جگہوں پر تو یہ کردار اتنے حقیقی لگنے لگتے ہیں کہ ان سے متعلق واقعات پر بھی حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ وہ ایسے موقعوں پر دیو مالا کی مدد سے ان میں معنی آفرینی پیدا کرتے ہیں اور اس کے ذریعے طنز کی کاٹ بہت گہری ہو جاتی ہے۔ مثلاً افسانہ ''متھن'' کا یہ اقتباس دیکھیے:

''اور سامنے تھا سراجا...... ایوز بیٹری کا ایجنٹ۔ اس کی دکان تھوڑا پیپل کے گھیر کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ لجلجے ہندو جس پہ صبح کے وقت آکر پانی ملے دودھ کے لوٹے ڈال جاتے اور دکان اور سڑک کے بیچ کی جگہ کیچ سے اٹ جاتی تھی۔ تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے سراجو کو لجلجے ہندوؤں کی اس رسم کا احترام کرنا ہی پڑتا تھا البتہ نہیں کرتے تھے تو دو غلے کتے جو دن بھر ٹانگ اُٹھا اُٹھا کر اس پیڑ پر پیشاب کرتے رہتے تھے جس کے بارے میں بھگوان نے کہا تھا...... اور ورکشوں میں میں پیپل ہوں۔ ضرور وہ پچھلے جنم میں مسلمان ہوں گے جو سینتالیس کے فسادوں میں ہندوؤں کے ہاتھوں مارے گئے۔''

یہی نہیں اور بھی کئی افسانے ہیں جن میں بیدی نے اسی طرح اساطیر سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ مثلاً لاجونتی، لمبی لڑکی، دیوالیہ وغیرہ ایسی کہانیاں ہیں جہاں اساطیر کا گزر کسی نہ کسی طور پر نظر آتا ہے۔ اس کا ایک سبب شاید یہ بھی ہو کہ بچپن میں ان کے گھر کا ماحول ایسا تھا کہ گرد گرنتھ صاحب اور گیتا کا پاٹھ وہاں ہوتا تھا۔ اپنے مضمون ''آئینے کے سامنے'' میں لکھا ہے:

''میرے ماں باپ ایک دوسرے کے جذبات اور خیالات کا بہت احترام کیا کرتے تھے۔ اس لیے گھر میں ایک طرف گرنتھ صاحب پڑھا جاتا تھا تو دوسری طرف گیتا کا پاٹھ ہوتا تھا۔ پہلی کہانیاں جو بچپن میں سنیں، جن اور پری کی داستانیں نہ تھیں بلکہ مہاتم تھے جو گیتا کے ہر ادھیائے کے بعد ہوتے ہیں اور جو بڑی شردھا کے ساتھ ہم ماں کے پاس بیٹھ کر سنا کرتے تے۔''

لیکن بنیادی طور پر بیدی کا اسلوب استعاراتی ہے۔ گوپی چند نارنگ نے ''اپنے دُکھ مجھے دے دو'' کا تجزیہ بھی اپنے مضمون ''بیدی کے فن کی استعاراتی اور اساطیری جڑیں'' میں بہت عمدہ کیا ہے۔ افسانے کے اجزا سے اساطیر کی جس طرح مطابقت انہوں نے اس میں ظاہر کی ہے، قابلِ مطالعہ ہے۔ یہاں ان باتوں کو دہرانا

بے فیض ہوگا۔

سریندر پرکاش نے اپنے افسانوں میں اساطیر کا استعمال ذرا مختلف انداز میں کیا ہے۔ ان کے یہاں سماجی اور سیاسی شعور بہت پختہ ہے اس لیے ان کے افسانے بغیر سماجی اور سیاسی شعور کی بالیدگی کے عام قاری کی گرفت میں آسانی سے نہیں آسکتے۔ اسے ان کے افسانوں کا ایک کمزور پہلو بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ یا یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ عام قاری کے لیے افسانہ نہیں لکھتے۔ چوں کہ سیاسی بصیرت کے ساتھ عصری مسائل پر روشنی ڈالنا آسان کام نہیں ہے۔ آدمی کی سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ وہ دوسروں پر تو چوٹ کر سکتا ہے لیکن اپنے اوپر چوٹ برداشت نہیں کر سکتا۔ شاید اسی لیے انہیں اپنے افسانوں کی کرافٹ پر خاص توجہ دینی پڑتی ہے اور استعاروں علامات کی مدد سے اپنی بات کو پُر اثر بنانا پڑتا ہے۔ دوسرے معنوں میں وہ صرف افسانہ نہیں لکھتے بلکہ اپنے عہد کا رزمیہ تحریر کرتے ہیں۔ ''بن باس ۱۹۸۱ء کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایودھیا واسی اپنے گھروں سے نکل کر نگر دوار کی طرف لپکے۔ وہاں خاصی بھیڑ ہوگئی اور کھوے سے کھوا چھلنے لگا۔ وہ اپنی گہری اور بوجھل سانسوں کے ساتھ اچک اچک کر جنگل کی طرف دیکھنے لگے کوئی کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ سب جانتے تھے...... اگر بھرت آرہے ہیں تو رام کو لے کر ہی آئے ہوں گے۔ رام آجائیں گے تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ سب دُکھوں کا انت ہوجائے گا۔''

یعنی رام یہاں نجات دہندہ کا ایک استعارہ ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے گوڈو کو بیکٹ نے **Waiting for Goddot** میں بتایا ہے۔ لیکن جب رام واپس نہیں آتے تو لوگوں میں مایوسی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ یہ انسانی مزاج کی غمازی ہے۔ اسی وقت یہ منادی ہوتی ہے کہ جب تک راجا رام نہیں آتے بھرت ہی راج کاج چلائیں گے اور رام کی کھڑاؤں راج سنگھاسن پر براجمان رہیں گی۔ اور پھر زندگی معمول پر آجاتی ہے:

''نگر کے بازاروں میں پہلے کی طرح چہل پہل شروع ہوگئی تھی۔ ویوپار اور لین دین ہونے لگا تھا۔ دکانیں مال اسباب سے بھری تھیں اور لوگوں کے چہرے چمکنے لگے تھے۔''

یہاں سے اسطور کی تہ میں ایک دوسری کہانی شروع ہوجاتی ہے۔ وہ کہانی جو سریندر پرکاش اپنے قاری سے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ قاری پر جب اس کے رمز کھلتے ہیں تو حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ افسانے کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں بھیکو کسان شبھ گرام سے نگر بازار میں اپنے اناج کے بدلے نمک لینے آتا ہے اور وہاں لین دین میں وٹھل سیٹھ کے چاکر اس کے اناج کو لوہے کی باٹ سے تول کر اس کے عوض نمک سونے کی باٹ سے تول کر دیتے ہیں تو وہ اس پر احتجاج کرتا ہے معاملہ بھرت کے دربار تک پہنچتا ہے جہاں نیائے کے لیے لوگوں کی لمبی قطار لگی ہے۔

بھیکو کسان کی بھی باری آئی...... وٹھل سیٹھ اور بھیکو اور بھیکو کا چھوٹا پتر آدی راج منتری کے نکٹ گئے۔

اب وہ تینوں اپنی اور راج منتری کی اور بھرت کی آواز سن سکتے تھے کہ فاصلہ ختم ہو گیا تھا اور وہ خود اپنی بیتی کا حصہ بن کر اپنی آپ بیتی کہہ رہے تھے۔ راج منتری نے ساری بات سنی اور پھر بھرت کو سارا ماجرا کہہ سنایا اور بھرت نے بڑی سنیہ بھری آواز میں پوچھا:

''شبھ گرام کے کسان بھیکو...... باٹوں کا وزن تو ایک ہی ہے تب تمہیں جنس تو لنے کے لیے باٹ بدلنے پر آپتی کیوں؟

بھیکو نے ہاتھ باندھ کر سر جھکا دیا اور نمرتا پورو ک بولا:

''مہاراج بات وزن کی نہیں۔ ملیوں کی ہے۔ میری جنس اگر لوہے کے باٹ سے تولی جاتی ہے اور وٹھل سیٹھ کی جنس اگر سونے کے باٹ سے تولی جاتی ہے تو ملیا میں انتر پیدا ہوتا ہے اور یہی انتر بھاؤ ناؤں میں انتر پیدا کرتا ہے اور بھاؤ ناؤں کا انتر ہی سنسار میں سب سے بڑا انتر ہے۔ مجھے یہ بھید بھاؤ، یہ انتر سویکار نہیں۔''

تو پھر تم راجا رام کی کھڑاؤں سے اپنا نیائے مانگ کر دیکھ لو۔'' بھرت نے کہا۔ ان کا نیائے تو تمہیں سویکارنا ہی پڑے گا۔

''بدی مجھے ان کا نیائے بھی نہ جچا تو......'' بھیکو کسان نے پوچھا۔

''تب تمہیں رام کے بن باس سے لوٹ کر آنے کی پرتیکشا کرنا پڑے گی۔'' بھرت نے جواب دیا۔

سریندر پرکاش کا افسانہ یہاں دیو مالا سے نہ صرف الگ ہو جاتا ہے بلکہ ایک طرح سے وہ اس سے اپنی ایک نئی دیو مالا تخلیق کرتے ہیں۔ اس قصے کے توسط سے کئی سوال وہ اپنے قاری کے سامنے رکھتے ہیں، جیسے کیا رام راجیہ میں ہر طرف نیائے ہی نیائے تھا؟ اگر تھا تو بھرت کے دربار میں اتنی لمبی قطار نیائے کے لیے کیوں لگی تھی؟ پھر چودہ برس بعد جب رام بن داس سے لوٹتے ہیں تو رتھ سے ان کی بجائے ان کی مورتیاں اُترتی ہیں تو کیا رام ایک ایسا تخلیق کردہ واہمہ ہے جس نے آدمی کو نجات کے دھوکے میں ڈال رکھا ہے اور رام کے نام پر ستیہ کا پرچار کر کے آدمی استیہ کے رواج کو جائز ٹھہرا رہا ہے۔ ان جملوں کی معنویت پر غور کیجیے:

''پرجا اب نیائے کے لیے سیدھا راجا رام کے پاس جاتی۔ اور راج منتری ٹھیک ڈھنگ سے انہیں نیائے دلوانے کی کوشش کرتا۔ اس نیائے سے لوگ بہت پرسن اور سنتشٹ ہونے لگے تھے اور دھیرے دھیرے حالت یہ ہو گئی تھی کہ اب کسی پرکار کے نیائے مانگنے کی آوشکتا ہی نہ رہ گئی تھی۔ نیم چپ چاپ سویکار کر لینا ہی اچت سمجھا جانے لگا۔ نگر کا راج کاج اور کاروبار اپنے آپ ہی ٹھیک ڈھنگ سے چلنے لگا تھا۔ سب طرف رام راجیہ تھا اور یہاں تک کہ ایک سویرے کسی نے شیر اور بکری کو ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے دیکھ لیا۔ نہ کوئی راجا رہ گیا تھا نہ کوئی پرجا۔ اب لوگوں نے راج دربار اور راج محل کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔''

اس طرح سریندر نے اپنے افسانے میں آج کے منظر نامے کو دامنے رکھتے ہوئے ایک بڑا اہم اور عجیب و

غریب سوال اُٹھایا ہے۔ یہ ان کے ذہن کی زرخیزی کا ہی کمال ہے کہ انہوں نے ایک دیومالا کو آج کے سیاسی حالات کے چوکھٹے میں بٹھا کے اسے ایک نئی معنویت عطا کی ہے۔ سیاسی اور سماجی صورتِ حال سے سروکار ان کا خاص موضوع ہے اور اسے انہوں نے اپنے افسانوں میں بڑی عمدگی سے برتا ہے۔ یہ سریندر پرکاش کے فن کا ایک بہت بڑا وصف ہے کہ ان کے یہاں واقعات کے تانے بانے افسانے کو پوری طرح نہیں کھولتے بلکہ جھلکیوں میں معنی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے تہہ داری بڑھ جاتی ہے۔ اس تعلق سے انتظار حسین نے لکھا ہے:

''سریندر پرکاش کے افسانے بس جیسے ہم دھند لکے میں سفر کر رہے ہیں۔ رستہ کچھ پہچانا کچھ ان پہچانا، چیزیں چہرے کچھ مانوس کچھ اجنبی، کچھ آج کے روز کے دیکھے بھالے کوئی صدیوں پرانا۔ انہیں شناخت کرکے اور کبھی شک کر کے کتنی حیرت ہوتی ہے۔ کہیں یہ حضرت عیسیٰ تو نہیں ارے یہ تو دروپدی ہے مگر یہاں کہاں؟ جدید اور قدیم کا عجب گھال میل ہے۔ انمل بے جوڑ عجب طور سے ملتے ہیں کہانی نئی ہے مگر اس کے رشتے پھیلتے پھیلتے دیومالا سے جا ملتے ہیں اور یہ سب کچھ کتنی خوش اسلوبی سے ہوتا ہے۔''

سریندر پرکاش کی طرح انتظار حسین نے بھی اپنے افسانوں میں دیومالاؤں کا بھرپور اور بامعنی استعمال کیا ہے۔ لیکن انتظار حسین کے یہاں موضوع سیاسی یا سماجی نہیں ہے بلکہ وہ اپنے افسانوں کی بنیاد اقدار کی زوال آمادگی کے المیے پر رکھتے ہیں جس سے لڑتے ہوئے آدمی برسوں سے شکست وریخت کے عمل سے گزر رہا ہے۔ نرناری، پورا گیان، پتے، کچھوے اور کشتی اس طرح کے کئی افسانے ہیں جو دیومالا کو بنیاد بنا کے لکھے گئے ہیں۔ افسانہ کشتی میں دو اساطیر کے اشتراک سے کہانی کی بنت کاری کی گئی ہے۔ ایک ہندو دیومالا میں منو کے واقعے سے اور دوسری اسلامی اسطور: قصۂ نوح سے۔ ان دونوں قصوں کی مماثلت قبل از تاریخ کے کسی واقعے کی نشاندہی بھی کرتی ہے جو اس زمین پر کبھی وقوع پذیر ہوا ہوگا۔ گو کہ اس کا زمانی تعین ناممکن ہے لیکن اس قصے کے بطن میں انسانی تاریخ کا اتنا بڑا المیہ ہے کہ آدمی میں اس وقت باوجود تاریخی شعور نہ ہونے کے، وہ واقعہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا اور ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا ہوا ہم تک بھی آ پہنچا۔ یہ نسلِ انسانی کے احیا کا مسئلہ تھا۔ دونوں قصوں میں کشتی کا استعارہ موجود ہے۔ منو اور نوح دونوں طوفان کی آمد سے قبل ہی اس کی ہیبت ناکی سے واقف ہو جاتے ہیں۔ وہ کشتی بنا کے اس میں اپنے ساتھ کچھ نیک لوگوں اور جانوروں کے ایک ایک جوڑوں کو لے کر سوار ہو جاتے ہیں اور طوفان میں ان کی کشتی کئی دنوں تک انجانی سمتوں میں بہتی رہتی ہے۔ دور دور تک زمین کا نام ونشان نہیں ہے۔ اندر حبس ہے اور باہر تیز بارش۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''بارکچھ کم ہوئی؟''

''بالکل کم نہیں ہوئی۔ اسی شور کے ساتھ ہوئی چلی جارہی ہے۔ یہ بارش ہے یا قیامت!''

''اندر کے حبس سے تو بہر حال بہتر صورت ہے۔''

''کوئی بہتر صورت نہیں۔ اندر حبس باہر بارش۔ آدمی آخر کہاں جائے؟''

''سب کچھ تو ڈوب گیا۔ اب آخر بارش کیوں ہوئے چلی جا رہی ہے۔''

''ہم جو باقی رہ گئے ہیں۔''

''ہاں بس ہم ہی رہ گئے ہیں۔ مگر ہم ہیں کتنے۔ انگلیوں پر گن لو۔ باقی تو چرند پرند ہی ہیں۔''

''ہاں باقی تو چرند پرند ہی ہیں۔ شاید اس لیے بھی حبس بہت ہو گیا ہے۔ جانوروں کے درمیان سانس لینا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کب تک ہم اس طور جانوروں کے درمیان بسر کرتے رہیں گے۔''

باہر اگر بارش کا نہ تھمنے والا زور ہے تو اندر کا حبس بھی جان لیوا ہے اور اس کا احساس تو اندر پناہ لینے کے بعد ہی ہو سکا۔ آدمی گو کہ خود بھی ایک جانور ہے لیکن دوسرے جانوروں کے درمیان قید میں اس کے لیے سانس لینا کتنا تکلیف دہ ہے۔ جب کہ کشتی کے اندر وہ سب پناہ گزیں ہیں پھر بھی گھٹن کے احساس سے پریشان ہیں۔ یہاں انتظار حسین نے آدمی کی خود فریبی اور شکست خوردگی کے اس المیے کو موضوع بنایا ہے۔ جس سے چھٹکارے کی تگ و دو میں وہ صدیوں سے مبتلا ہے۔ اور پھر انہیں اپنا گھر یاد آتا ہے۔ وہ گھر جس کی محبت نے اس زمین سے ان کی وابستگی قائم رکھی اور جس کے بغیر ان کی زندگی ادھوری ہے۔ انہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ نہ جانے کتنے دنوں سے سفر میں ہیں۔ دنوں سے یا برسہا برس سے۔ احساس کا یہ زیاں انہیں اور دکھی کرتا ہے۔ باہر بارش اب تھم چکی ہے یعنی بظاہر حالات موافق ہو رہے ہیں تاہم اچانک انہیں احساس ہوتا ہے کہ نوح تو کشتی میں نہیں ہیں۔ یہ احساس انہیں پھر مضطرب اور پریشان کر دیتا ہے۔ اسی طرح انہیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کشتی اب مچھلی کی دم سے بندھی نہیں ہے۔ مچھلی کہیں غائب ہو گئی ہے اور رسی سانپ کی طرح پانی میں کشتی کے پیچھے لہرا رہی ہے۔ وہ ایک عجیب مخمصے میں پڑ جاتے ہیں۔ کہانی اب واقعے کی حقیقت سے بلند ہو کے زمانے پر محیط ہو جاتی ہے اور ہمارے آج کے المیے کا اظہار بن جاتی ہے:

''کیا ہم کبھی واپس نہیں جا سکیں گے؟''

''کہاں؟''

''اپنے گھروں کو۔''

اپنے گھروں کو؟ ایک بار پھر انہیں حیرانی نے آلیا۔ گھر۔ ایک بار پھر گھروں کی یاد نے انہیں ایسے آن لیا جیسے کوئی بڑا جھکڑ پیڑوں کو آلے اور انہیں ہلا دے۔

آدمی خارجی حالات سے لڑتے ہوئے مفاہمتوں اور خود فریبی سے زندگی کو جتنا سہل بنانے کی کوشش کرتا ہے، داخلی سطح پر کہیں ایک احساسِ زیاں اسے اتنا ہی بے چین رکھتا ہے۔ جس زندگی سے بھاگ کر وہ ایک نئی زندگی کی تلاش میں نکلا تھا کیا وہ اسے مل گئی؟ یا وہ ایک فریب خوردگی کا شکار ہو کے اپنے ماضی سے کٹتا جا رہا ہے۔ انتظار

حسین کے یہاں ماضی انسان کا ایک ایسا اثاثہ ہے جو اس کے مستقبل کی اساس ہے۔ لوگ بھلے ہی اسے ان کی ماضی پرستی کا نام دیں، یہ سچ ہے کہ ماضی کے ان قصوں میں موجود اقدار اور ان سے جوجھتا لڑتا آدمی زندگی کی ایک ایسی پہچان رکھتا ہے جو زمین پر اس کی بقا کی ضمانت ہے۔ ورنہ تہذیب اور ترقی کے نام پر آج دنیا نے آدمی کو تباہی کی جس کگار پر لا کھڑا کیا ہے اس کا سب ہی کو بخوبی اندازہ ہے۔ اپنے مضمون: ''بکرم، بیتال اور افسانہ'' میں وہ لکھتے ہیں:

''جنگل میں آدمی جس خوف سے آشنا ہوتا ہے وہ شہر کے خوف سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ نامعلوم کا خوف ہوتا ہے۔ نامعلوم کا خوف آدمی کی ذات میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرتا ہے۔ مگر اب نامعلوم کا خوف غائب ہے۔ اب ہم معلوم کے خوف میں مبتلا ہیں۔ جنگ کا خوف، خانہ جنگی کا خوف، لسانی فسادات کا خوف، رکشا کے حادثے میں کام آجانے کا خوف، کسی غنڈے کے ہتھے چڑھ جانے کا خوف۔ خوف کی یہ صورتیں ذلت آمیز صورتیں ہیں اور موت کے یہ طریقے کتنے بے وقار ہیں۔''

ماضی اس کے لیے ہمیشہ سے باعثِ عذاب رہا ہے لیکن اس کے تجربے نے زندگی میں اسے بہت کچھ دیا بھی ہے۔ قدم قدم پر اس کی رہنمائی کی ہے اس لیے اس کی اہمیت سے انکار بھی ممکن نہیں ہے۔ دراصل ہم اس کی اذیت ناکی سے بچنے کے لیے فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اپنے گرد ایک خود فریبی کا جال بن لیتے ہیں۔ انسانی جبلتوں سے عہدہ برآ ہونا آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے اس کے تقاضوں کی بجا آوری کی آسان صورتوں کا وہ متلاشی رہتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ سماج کے بنائے ہوئے اخلاقی ضابطوں اور قوانین کی نفی کرتا ہے بلکہ بعض اوقات حالات ایسی غیر یقینی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ ان سے بچنے کی اسے کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ افسانہ ''پتے'' میں اس کی بہت عمدہ مثال انتظار حسین نے پیش کی ہے۔ جب گرو آنند اپنے ساتھی سنجے کو سندر سمدر بھکشو کی کتھا سناتے ہیں کہ کس طرح وہ ایک کنچنی کے جال میں پھنستا ہے:

سندر سمدر ہر روز بھکشا پاتر لے بستی میں پہنچتا۔ کبھی اس گلی میں کبھی اس گلی میں۔ ایک روز وہ اس گلی میں آیا اور اس اُونچی حویلی کی ڈیوڑھی پہ پہنچا۔ وہ کنچنی تو بات ہی دیکھ رہی تھی۔ تھال لے کر خود ڈیوڑھی پر آئی۔ ایسی چترائی سے بات کی اور بھکشا دی کہ سندر سمدر نے اگلے دن پھر اسی گلی کا پھیرا لگایا اور اسی ڈیوڑھی پر آیا۔ پھر وہ اس ڈیوڑھی سے ایسا ہلا کہ دوارے دوارے جانا چھوڑا۔ روز اس ڈیوڑھی پہ جا کھڑا ہوتا اور بھکشا پاتر بھروا کے لوٹتا۔ ایک دن چترائی سے کہنے لگی کہ ''بھکشو جی، تمہارے نیم کوئی فرق نہ پڑے تو آج یہیں پدھارو اور بھوجن کرو۔ میں جانوں گی کہ میری کٹیا کو چار چاند لگ گئے۔

سندر سمدر نے وچار کیا۔ پھر دل میں کہا کہ تتھا گت نے کبھی کسی کو نا نہیں کیا۔ ایک مورکھ نے ان کے سامنے بھوجن کے نام ماس لا کے رکھ دیا۔ اس پر بھی نا نہیں کہا اور ماس کھا لیا۔ مجھے بھی یہی نیتی اپنانی چاہیے۔

سوسندر سمدر نے اس دن اسی ڈیوڑھی میں بیٹھ کے بھوجن کیا۔

اس طرح وہ کنجنی بھکشو کو دھیرے دھیرے ایک دن کوٹھے پر اپنی اٹریا میں لے گئی اور اس کے ساتھ ایسا کھل کھیلی کہ:

''بے حیا نے نہ اپنے بدن پر کوئی دھجی رہنے دی اور نہ اس کے تن پہ کوئی لتار ہنے دیا۔ سینہ سے سینہ اور رانوں سے رانیں بھڑنے لگیں۔''

اس کتھا کو سننے کے بعد بھکشو سنجے اپنی بے چینی اور ان جذبات سے چھٹکارا پانے کے لیے نگر چھوڑ کے جنگل جنگل پھرتا ہے۔ اسے یاد آتا ہے، تتھاگت نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ''میں نے پراکرتی کے بھید جانے پر ناری کے بھید بھاؤ نہیں جان پایا۔'' پھر وہ ایک گھنے پیڑ کے نیچے برسوں تپسیا کرتا ہے۔ جس کے بعد اسے محسوس ہوتا ہے کہ اب وہ شانت ہو گیا ہے۔ اس کے من میں بیراگ رچ گیا تھا۔ وہ بھکشا پاتر لیے پھر نگر میں جاتا ہے اور بے ارادہ اسی کنجنی کے دوار پر پہنچ جاتا ہے۔ اسے اسی حال میں دیکھ کر وہ حیران رہ جاتا ہے۔ انتظار حسین نے یہاں انسانی جبلت کی بہت خوب صورت تشریح کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''من اس کا پھر بیاکل تھا اور آتما پھر دکھی تھی۔ رت پھر بدلنے لگی تھی۔ لنڈ منڈ پیڑوں میں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے ایک وسوسے کے ساتھ اپنے اندر جھانکا، کیا میرے بھیتر پھر کوئی کونپل پھوٹ پڑی ہے اور اس اچنبھے کے ساتھ سوچا کہ اپنے دیپ کے اجالے میں چلتے چلتے میں کہاں آ گیا ہوں اور یہ کیسے پتے ہیں کہ میری مٹھی میں آ گئے ہیں۔''

اقدار، جبلتوں اور مذہب کے درمیان پھنسے ہوئے آدمی کی جو دُردشا ہوتی ہے ان اساطیری قصوں میں اسے اس کی تصویر کشی ملتی ہے جنہیں پڑھ کے یا سن کے وہ قدرے تسلی پاتا ہے۔ اسے اپنے دُکھ اور غم اجنبی نہیں معلوم ہوتے اور ان کی کیفیت میں کمی کا احساس ہوتا ہے۔ انتظار حسین نے ہندو دیومالا اور اسلامی اساطیر کے استفادے سے اُردو افسانے میں معنویت کی ایک گہری تہہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اساطیر کی توسیع کر کے واقعہ طرازی کی ایک الگ راہ بھی نکالی ہے جیسے افسانہ ''آخری آدمی'' کی پوری کہانی انہوں نے بنی اسرائیل کی عذاب زدہ قوم کے گرد اس خوب صورتی سے بنی ہے کہ وہ حقیقی لگتی ہے۔ لیکن عام طور پر وہ آج کی زندگی کو پیشِ نگاہ رکھتے ہوئے اسطور کی مدد سے انسان کے باطن میں پنپنے والے خیر و شر کے تصادم اور اس کے ٹوٹنے بکھرنے کے عمل کو پیش کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہ المیہ کوئی نیا نہیں ہے بلکہ زمین پر زندگی اور سماج کے تقاضوں میں تفاوت اور کسی قدر تضاد کی بناء پر یہ صورت حال زمانہ قدیم سے چلی آ رہی ہے اور باوجود اتنی ترقی کے آدمی آج تک ان مسائل سے باہر نہیں نکل پایا ہے۔

زندگی کی بے وقعتی اور آدمی کی کم مائگی انتظار حسین کے افسانوں کا موضوع ہیں۔

شمیم حنفی نے آخری آدمی کے تعلق سے لکھا ہے:

''ہمارے زمانے کا روحانی افلاس اور اخلاقی زوال انتظار حسین کا بنیادی سروکار ہے۔ وہ اس زوال اور محرومی کے نوحہ گر نہیں، اس کے عکاس ہیں کہ انتظار حسین اپنے منصب کا جتنا گہرا شعور رکھتے ہیں اس کی مثالیں ہماری پوری روایت میں بہت کم یاب ہے۔''

انتظار حسین، سریندر پرکاش اور بیدی کے اس تخلیقی روّیے نے اُردو افسانے میں معنوی وسعت کی ایک نئی راہ کھولی۔ بنیادی طور پر ان تین افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں دیومالا کا۔ جس طرح استعمال کیا ہے اس کے اثر سے اُردو افسانے میں ایک نئے اسلوب نے جنم لیا۔ ان کی اس کوشش کے بعد بہت سے افسانہ نگاروں نے دیومالا کے حوالے سے اپنی بات کی توسیع اور رنگ آمیزی کی کوشش کی ہے۔ جیسے جوگندر پال، سلام بن رزاق، کنور سین، جتندر بلو، دیوندر اسر، کمار پاشی، دیوندر ستیارتھی وغیرہ۔ قرۃ العین حیدر بھی اُردو کی ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے بھی اپنے افسانوں میں اسطور سے فائدہ اُٹھایا ہے لیکن بہت کم۔ افسانہ ڈالن والا'' میں انہوں نے ایک جگہ دروپدی کے حوالے سے اپنی بات یوں کہی ہے:

''جل دھرا کی آمد پر باقی ٹوکروں کی بیویوں نے آپس میں چہ میگوئیاں کی تھیں...... ''یہ پہاڑیوں کے ہاں کیسا برا رواج ہے ایک لگائی کے دو دو تین تین خاوند...... '' اور جب جل دھرا کا تذکرہ دوپہر کو کھانے کی میز پر ہوا تھا تو باجی نے فوراً دروپدی کا حوالہ دیا تھا اور کہا تھا پہاڑوں میں پولی اینڈری کا رواج مہابھارت کے زمانے سے چلا آتا ہے اور ملک کے بہت سے حصوں کا سماجی ارتقا ایک خاص اسٹیج پر پہنچ کر وہیں منجمد ہو چکا ہے اور پہاڑی علاقے بھی ان ہی پسماندہ حصوں میں سے ہیں۔''

چوں کہ اسطور ان کا موضوع نہیں ہے اس لیے اس کا گزران کے افسانوں میں مقابلتاً کم ہے۔ جوگندر پال نے البتہ اپنے افسانوں میں دیومالا کا جا بجا استعمال عمدہ طریقے سے کیا ہے۔ ان کے یہاں دیومالائی کردار ہو یا واقعہ اس کا کہانی سے دوہرا رشتہ ہوتا ہے۔ ایک تو اصل واقعے کے طور پر دوسرا کہانی کے بطن سے جھانکتا ہے۔ اس طرح واقعے کی اثر آفرینی بڑھ جاتی ہے۔ وہ انسانی زندگی سے کردار اُٹھا کے ان کی خصوصیات اور جبلتوں کو دیومالا پر منطبق کرتے ہیں۔ مثلاً افسانہ ''عفریت'' میں راون کے استعارے سے انہوں نے انسان کی تخریبی جبلتوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ اپنی تمام تر عفونتوں کے ساتھ ہمارے سامنے عیاں ہو جاتی ہے۔ افسانے کا واحد متکلم اپنے بارے میں جب کہتا ہے:

''رام لیلا میں راکشش کسی کو جاں بلب پا کر اس طرح بے اختیار ہنستے ہیں گویا انہیں گدگدایا جا رہا ہو۔ میرے ذہن میں دراصل ایک آبدوز کشتی چلی آ رہی تھی جس میں لاکھوں کے خودکار تخریبی ہتھیار لدے ہوئے تھے۔ پچھلے سال اپنے ہوٹل میں مسافروں میں سے میرا ملنا ایک ایسے صنعت کار سے ہو گیا جو تیسری دنیا کے ممالک میں

افیون اور کوکین کے عوض ہتھیار سپلائی کرتا تھا۔ میرا اس سے معاملہ پٹ گیا تو میرا بیشتر وقت اسی کاروبار میں صرف ہونے لگا۔ ہوٹل ووٹل تو دکھاوے کا پیشہ ہو کر رہ گیا۔ کوئی اچھا تاجر تو ایک ہی تھیوری کو کام میں لاتا ہے۔ ڈیمانڈ اور سپلائی کی تھیوری۔''

آدمی خود غرضی کا مارا ہوا ہے یہ تو درست ہے لیکن یہاں اس کی سفاکی کتنی کر یہہ ہوگئی ہے۔ وہ سب جانتا ہے اور اپنے ہر فعل کے لیے پہلے سے جواز رکھتا ہے۔ ہم جان جاتے ہیں کہ راون جس کے دس سر تھے اور وہ دس سروں والا وِدوان سیتا ہرن کیوں کرتا ہے؟ یہ چھوٹے چھوٹے سوالات افسانے میں انسانی جبلتوں کی پرتیں کھولتے ہیں۔

انسانی زندگی میں جذبوں کی بڑی اہمیت ہے۔ بلکہ جذبوں کے لین دین سے ہی اس کی شناخت قائم ہے۔ محبت اور نفرت بظاہر دو لفظ ہیں لیکن انہیں سے اس کی زندگی میں رنگ ہے۔ اس کے بدلتے تناسب سے رنگ ہلکا گہرا ہوتا رہتا ہے، تاہم زندگی کی معنویت طے کرنے میں ان جذبوں کے ساتھ جبلتیں بھی کارفرما نظر آتی ہیں۔ بعض اوقات تو یہ جبلتیں جذبوں سے متصادم ہو کر اس کی صورت ہی بدل دیتی ہیں۔ مثلاً آدمی کی جبلتوں میں سب سے قوی اس کی بھوک ہے۔ جب وہ اپنی انتہا پر پہنچتی ہے تو آدمی کو کتنا سفاک بنا دیتی ہے اس بات کو کنور سین نے اپنے افسانے ''بھومکا'' میں جس طرح دیو مالا کی مدد سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے ملاحظہ ہو:

''رات آدھی سے زیادہ گزرتے ہی گاندھاری تھکاوٹ کا احساس کرنے لگی۔ دھیرے دھیرے غم کی آنچ ماند پڑنے لگی اور پیٹ کی آگ سلگنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں وہ بیٹوں کو بھول کر بھوک کی پکار سننے لگی۔ اسے بجھانے کی چنتا کرنے لگی۔ کرشن جا چکے تھے۔

بدحواس گاندھاری نے آس پاس نظر دوڑائی۔ آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ ذرا فاصلے پر انار کا پیڑ کھڑا نظر آیا۔ شاخوں پر لٹکتے پکے ہوئے سرخ انار گاندھاری کو بلا رہے تھے۔ مہارانی اٹھی۔ پیڑ کی طرف بڑھی۔ اسے یقین تھا انار اس کی پہنچ میں ہیں۔

لیکن انار کے پیڑ کے نیچے پہنچتے ہی گاندھاری نے دیکھا پھل اس کی پہنچ سے ہاتھ بھر اونچے لٹک رہے ہیں۔ وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ دوسرے ہی پل وہ لپکی۔ پاس پڑی ایک بیٹے کی لاش گھسیٹ لائی۔ لاش کو پیڑ کے نیچے رکھ کر اس پر کھڑی ہوگئی۔

گاندھاری کی حیرانی کا ٹھکانا نہ تھا۔ پھل اب بھی اس کی پہنچ سے باہر تھا۔ وہ لاش سے اُتری۔ دوسرے بیٹے کا مرا ہوا شریر گھسیٹ لائی۔ اسے پہلے بیٹے کی لاش پر رکھ کر اس پر کھڑی ہوگئی۔ پھل اب بھی اس کی پہنچ سے باہر تھا۔

بھوک سے پاگل گاندھاری نے لاشوں کا مینار کھڑا کر دیا۔ اپنے بیٹوں کی لاشوں کا انبار۔''

اسی طرح مہابھارت سے ''یک لویہ'' کا قصہ نقل کرتے ہوئے سلام بن رزاق بھی موجودہ زمانے پر اس کا انطباق کرتے ہیں اور جب دوسرے جنم میں وہی یک لویہ میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لینے پہنچتا ہے تو اسے پھر اس کی ودیا پراپت کرنے کی دیرینہ خواہش پوری نہیں ہوتی۔ پرنسپل (درونا چاریہ) اسے کالج میں داخلہ دینے سے انکار کردیتے ہیں۔ دیکھیے یہ منظر:

''ایسا نہ کہو ہرنیہ۔ تم نہیں جانتے ہم آج بھی کتنے مجبور ہیں۔''

''آپ کی کیا مجبوری ہوسکتی ہے سرکار؟''

''ہرنیہ تم ساڑھے تین ہزار برس کے بعد بھی مورکھ ہی رہے۔''

''سرکار، چھوٹا منہ بڑی بات۔ اس بکھت ہمارا جنم شدروں میں ہوا تھا مگر آج تو ہم شدر نہیں ہیں۔ یک لویہ کو اپنا شیشیہ بنانے میں اب کیا کٹھنائی ہوسکتی ہے۔''

یہی تو گڑ بڑ ہے ہرنیہ! زمانہ بدل چکا ہے۔ تم آج بھی شدر یا ہریجن ہوتے تو میں آنکھیں بند کرکے یک لویہ کو بی سی کے کوٹے سے سیٹ دے دیتا۔ مگر اب اڑچن یہی ہے کہ تم شدر نہیں ہو۔ یک لویہ بڑا ابھاگا بڑا ابھاگا ہے۔ جب اسے کسی برہمن یا کشتری کے گھر میں جنم لینا چاہیے تھا اس نے شدر کے گھر جنم لے لیا اور جب اسے ہریجن کے گھر میں جنم لینا تھا تو پیدا ہوا غیر ہریجن کے گھر میں۔'' اب تم ہی بتاؤ ہم کیا کرسکتے ہیں۔''

سرکار کچھ بھی کیجیے۔ اس بار نراش مت لوٹائیے۔ بڑی آشا لے کر آیا ہوں آپ کے چرنوں میں۔''

''ہم مجبور ہیں ہرنیہ۔''

''سرکار''

''چپراسی۔'' پرنسپل درونا چاریہ نے چپراسی کو آواز دی۔

چپراسی لپک کر اندر آیا۔

''دوسرے اُمیدوار کو بھیجو۔''

درونا چاریہ نے ہرنیہ اور یک لویہ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

غریب اور مجبور ہر زمانے میں دبایا گیا، کچلا گیا ہے۔ انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کو مقدر کا نام دینے پر یہ طنز کتنا گہرا ہے۔ یہاں سلام نے ایک دیومالائی قصے کو من وعن آج کے حالات سے مطابق بتاتے ہوئے نقل کردیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے زمانہ بدل گیا ہے لیکن حالات جوں کی توں ہیں۔ اس میں اسطور کی مدد سے کوئی معنوی توسیع نہیں ہوتی۔

جتندر بلو نے بھی اپنے بعض انسانوں میں دیومالا کو برتا ہے حالاں کہ ان کے یہاں اس کا استعمال بہت شعوری طور پر نہیں ہے لیکن اپنی بات میں اثر پیدا کرنے میں وہ اس کی مدد سے کامیاب ہیں خاص طور پر افسانہ

''چھلاوہ'' میں انہوں نے اسطور کی مدد سے اپنی بات جس طرح پیش کی ہے اس سے کہانی میں ایک حسن بھی پیدا ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ دونوں براعظم کھو بیٹھا ہے، وہ اس کے لیے گئی گزری کہانیاں بن چکے ہیں۔ وہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا؟ داخلی شناخت اس کا اہم مسئلہ بن چکی ہے؟ اس کا جسم یورپ میں ہے تو روح اپنے وطنِ عزیز میں۔ جانے کیوں غیر متوقع طور پر، اچانک مجھے ایک ہندو دیومالائی کردار ترشنکھو یاد آ گیا، جو دھرتی اور آکاش کے بیچ رشی وشوامتر اور وششٹ کی ذاتی لڑائی کے کارن یگوں پہلے لٹک کر رہ گیا تھا۔ شاستروں کے انوسار وہ آج بھی وہیں لٹکا ہوا ہے۔ گو شنکر کے حالات ترشنکھو سے بہت مختلف تھے، لیکن بنیادی مسئلہ یکساں تھا۔''

دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی کہیں کہیں اسطور کے ذریعے کوئی بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے انور قمر کا افسانہ ''منو کی ارتھ ہین یاترا'' یا محافظ حیدر کا افسانہ ''بھگوان سمپورنا نند'' جس میں بھگوان بدھ۔ کے نئے زمانے میں پنر جنم کے حوالے سے زندگی کے دائمی دکھوں میں گھری رہنے اور اس سے جوجھنے کی بات کہی گئی ہے۔ ممکن ہے کچھ اور بھی افسانہ نگار ہوں جنہوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے افسانوں میں اساطیر یا دیومالا کا استعمال کیا ہو۔ میرا مقصد اس مضمون میں اس تخلیقی روّیے کی نشاندہی کرنا ہے۔ جس نے ساٹھ کی دہائی سے اُردو افسانے میں نمایاں طور پر جگہ پائی اور اس کے اثر سے اُردو افسانے میں نئی معنوی جہتوں کے امکانات پیدا ہوئے اور اس کا منظر نامہ وسیع تر ہوا۔

❁❁

Address:

دُھوپ

وزیر آغا

کہا میں نے...... آ
اپنے برفاب گھر کے مقفل کواڑوں
کو اب کھول اور اس سمندر کو تک
جو خنک تیرگی کی سیہ باڑ کو پار کر کے
ترے گھر کی دہلیز تک آ گیا ہے!
یہ اُجلی عمارت کا سیلِ رواں
میرے خستہ بدن سے
تھکاوٹ سی میلی تہوں کو اُتارے
مرے بند کانوں میں
بھونروں کی بانی کا امرت گرائے
مجھے اپنے پھیلے ہوئے زرد دامن میں بھرے
میں سونے لگوں تو مجھے گدگدائے
میں جاگوں تو میرے پپوٹوں پہ کرنوں کی،
خوابوں کی برکھا اُنڈیلے
یہ اُجلی تمازت کا سیلِ رواں اب
مجھے پار کر کے
ترے در پہ دستک اگر دے رہا ہے
تو اپنے مقفل کواڑوں کو تو کھول، باہر نکل
ہاتھ اپنے ہلا کر اسے اپنی جانب بلا
اپنے خستہ بدن پر سے تو اپنی میّت کا پتھر ہٹا
گھاس کو اذن دے
وہ حسیں، سبز قالین اپنا بچھائے
درختوں پہ گجرے نظر آئیں، طائر چہکنے لگیں
برف پگھلے
غصیلی، سرافراز، بے رحم ٹھنڈی ہوا
اپنے گھر کو سدھارے
دُکھی فرش سے ماورا عرش تک
دھوپ کا اک ہمکتا سمندر رہے موج زن
جس میں تو اور میں
سرخ بجروں کی صورت، نہ ڈوبیں نہ اُبھریں
فقط دھوپ کو اپنے چہروں پہ مل کر کہیں:
ہم امر ہو گئے ہیں!!

❁❁

Address:

عام سی واردات

محمد اسلم عمادی

ہوا ابھی تھی سب کے درمیان ناچتی ہوئی

وہ اب کہاں چلی گئی؟

نفس نفس کی تازگی بھی بن گئی دھواں، چلی گئی!

وہ ریل جس سے جھانکتی تھی اک حسینہ گماں:

چلی گئی!

اور ہم سے تشنہ لب سارے

لو لگائے۔ سکتہ میں کھڑے ہیں

پاؤں چوب وقت میں کیلوں سے جڑے ہیں

اک سیاہ سرخ سا پرندہ

بھیڑ دیکھ کر

فضا میں تیرتا ہوا

نکل چکا ہے۔ تیری طرف

(اس کا سایہ دوڑتا چلا گیا زمین پر!)

ہم کو اس سے کیا؟

ہوا کہاں گئی۔ ریل کیا ہوئی۔ اور پرند کون تھا

ہم اس سوال نامہ پر اڑے ہیں!

کتنی سمتیں ہیں؟

ان نئے رخ بدلنے کی ساعتیں ہیں کون سی؟

ساعتوں کے نئے موسم میں کس کی آہٹیں ہیں؟

جانے کب جواب کا طلوع ہوگا؟

جانے کب!!

❀❀

Address:
Kuwait Oil Company
Post Box # 9758
Ahmadi : 61008
(Kuwait)

سب سے پہلے

اقبال فریدی

خلا میں پہنچے
بندر او. انگہ.
خلا میں جا کر
ہارن بجا کر
دیکھے سب مستور
چاند ستارے
چھو کر آئے
اپنی زمیں سے دور
دل کے شیشے
زمیں پہ کیسے
ہو گئے چکنا چور
کہیں سے لاؤ
اے سیارو
زمین کے جیسا نور
گڈے جیسے
نیک فرشتے
گڑیا جیسی حور!

❀❀

Address:
Station Director
Radio Pakistan
Karachi

بادباں کھول دو

شاہین مفتی

اس سے پہلے
کہ پھر کوئی پاگل ہوا
دجلۂ وقت میں
کشتئ جاں کا رُخ موڑ دے
بادباں کھول دو
ساحلوں پر کھڑے
ان رفیقوں کو آواز دو
جن کی آنکھوں میں
موسم کے سب ذائقے ہیں
زندگانی کے ایسے سفر پہ چلو
جس جگہ یہ زمیں، آسماں
ایک ہیں!

❀❀

Address:
Ibn-e-Ameer Girls Degree College
Jalalpur Jattan
(Panjab) Pakistan

کیب ڈرائیور

شاہین

بھید بھرے
نیویارک، ٹورنٹو
آٹو اور کیوبک کی سرکش سڑکوں پر
دور دیس سے آئے ہوئے
موگادیشو، بیروت
پشاور اور پنجاب کے البیلے وارث شہزادے
اپنی اپنی جان اور قسمت
بند ہتھیلی میں رکھے
ٹیکسیوں میں
اپنے اپنے سپنے لادے پھرتے ہیں

❀❀

Address:
1328 Potter Drive
Monotick Ontario
K4M 106, (Canada)

حساب کا دن

نسرین آفتاب

جب سورج اور چاند
بے نور ہوجائیں گے
جب ستارے بکھر جائیں گے
جب پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائیں گے
اور سارے سمندر
ابل جائیں گے
اور تب
جامعہ حفصہ کے
ملبے میں مدفون
سب بچیوں سے
یہ پوچھا جائے گا
تمہیں کس جرم میں قتل کیا گیا؟
اور پھر
وہ خالقِ بحر و بر
ربِ جن و بشر
لال مسجد و جامعہ حفصہ میں
بہنے والے ہر ایک قطرۂ خون کا
حساب لے گا!

❀❀

Address:
A-4 Rabia Villa
University Road
Karachi : 75270

کاروبار میں تیزی کا رجحان

تسنیم عابدی

گھر کے دسترخوان پہ
روٹی سالن ہے
گھر والی نے جوڑا نیا بنایا ہے
فضلو! میرے سونے کے گہنوں کا شوق
پھولوں کے گجرے ہی سے پورا کر دے
ریشماں! سارے وعدے اب پورے ہوں گے
سرخی، پاؤڈر، کاجل تجھ کالا دوں گا
تیری مانگ بھی افشاں سے چمکاؤں گا

فضلو! تیرے نام کیا لاٹری نکلی ہے!
پہلے تو تُو وعدوں سے کتراتا تھا
بدحالی پہ آنکھیں مجھ سے چراتا تھا

تجھ کو کچھ معلوم نہیں الھڑ بھولی
کتنی مہربان ہے قسمت کی دیوی
بم کے دھماکے ہونے سے اس بستی میں

روز نئی قبریں کھدوائی جاتی ہیں
کاروبار میں تیزی آتی جاتی ہے
تیرے دسترخوان پہ اب رونق ہوگی
میں تجھ کو اب گہنے بھی دلواؤں گا
موت کا کاروبار بہت زوروں پر ہے

ریشماں! بس یہ دعا کر تیرا فضلو
کیا ہی اچھا ہو عراق چلا جائے
یا افغانستان ہی جانا ہو جائے
پھر تو قسمت ایسی پلٹا کھائے گی
سونے میں تو پیلی ہوتی جائے گی
ایشیاء میں بس گورکنی کا پیشہ ہی
بہت منافع بخش دکھائی دیتا ہے
موت کا کاروبار بہت زوروں پہ ہے
روز نئی قبریں کھدوائی جاتی ہیں!

❁❁

Address:
Post Box # Abu Dhabi
(U.A.E.)

پیاسے بادل

یعقوب راہی

تم سے اُمید کوئی کیا رکھے؟
تم تو آوارہ بادلوں کی طرح
کب کہاں اک جگہ ٹھہرتے ہو
سب کو للچائے اڑتے پھرتے ہو
آپ ہی آپ میں سمٹتے ہو
خواب منظر اجاڑ جاتے ہو
کوئی رم جھم نہ کوئی سیلِ رواں
پیاس دھرتی کی بڑھتی جاتی ہے
حیرت فصل گل رلاتی ہے
راستے اور ہی بجھاتی ہے

❁❁

Address:
101 Arpan Apartment
Luxmi Park Nayanagar
Meert Road, Mumbai : 401107

کھیل تماشے جاری ہیں

یعقوب راہی

کیا مسجد؟
کیا مندر؟
کیا گرجا گھر؟ کیا گردوارا؟
سب کے سب تو دھکاوے تھے، دھکاوے ہیں
انسانی بٹوارے ہیں
صدیوں پہلے
ہم سب میں جو ایک درندہ در آیا تھا
آج بھی شاید وہ زندہ ہے
اپنے کھیل رچاتا ہے
انسانوں کو انسانوں سے کٹواتا، مرواتا ہے
اپنی پیاس بجھاتا ہے
ہر آئے دن
بستی بستی، گلی گلی
بھاشا، دین دھرم کی خاطر
کیسے کیسے کھیل تماشے جاری ہیں
چوکھٹ چوکھٹ
سمٹی، سہمی، بھیگی آنکھیں
بس آنسو ٹپکاتی ہیں

❁❁

یہ وقت کیا ہے!

سلیم انصاری

یہ وقت کیا ہے؟
کہ اپنے معمول سے گریزاں ہر ایک شے ہے
ہر ایک لمحہ
گذشتہ لمحات کی نفی ہے
عجیب وہم ویقین کا امتزاج
سوچوں میں گھل گیا ہے
جو خواب دیکھو
تو زندگی پر یقین آئے
دیے بجھا دو
تو روشنی پر یقین آئے
سراب۔ دریا ہے
اور ریگ رواں سمندر
بدن پہ زخموں کا جال ہے
جگنوؤں سے لکھی ہوئی عبارت
یقین و ہم و گمان کی حد
شکستگی امتحان کی حد
یہ وقت کیا ہے؟
کہ اپنے معمول سے گریزاں ہر ایک شے ہے!

خواب نظم

اس نے کہا تھا
خواب نہ دیکھو
خواب تو ایسے پنچھی ہیں
جو تعبیروں کے جنگل میں کھو جاتے ہیں
جنگل ایسا
جس سے باہر آنے والے سارے رستے
اندیشوں کی دھند میں لپٹے رہتے ہیں
اس نے شاید ٹھیک کہا تھا
خواب نہ دیکھو
خواب دیکھنے والی آنکھیں
بے منظر ہو جاتی ہیں!

اعتراف

میں اپنی نظموں کی بے ثباتی سے آشنا ہوں
میں جانتا ہوں
کہ میرے الفاظ بے صدا ہیں
مجھے خبر ہے
کہ زخم خوردہ ہیں میرے جذبے
مجھے پتہ ہے
کہ میرے لہجے کی آگ سے کوئی اب تک جلا
نہیں ہے
مری صداقت سے جھوٹ کوئی مرا نہیں ہے
یہ سچ بھی پیش نظر ہے میرے
کہ میری نظموں سے آج تک
انقلاب آیا نہیں ہے کوئی
میں اپنی نظموں کی بے ثباتی سے خوب واقف ہوں
پھر بھی
تخلیق کا یہ عمل ضروری بہت ہے، مجھ کو
کہ میری نظمیں ہی
میرے اندر کی کشمکش کے فشار سے
بچ نکلنے کا راستہ ہیں!

❁❁

مٹی کی چڑیا

شہلا نقوی

تیری ذات کا منظر نامہ
روشن رنگیں خواب
نیلے گگن پر جس کے
اڑا کرتے ہیں تند عقاب
میں بیٹھی ہوں
تال کنارے
اوک میں ہے اک خواب
گیلی مٹی کی اک چڑیا
دل میں چھپی اک آس
کوئی مسیحا اس کو دے دے
اُڑ جانے کی بساط!

Address:
15 Daniels While
New Yourk Planes
10604-3303

ماں*

پروین شیر

میں نے تیری انگلیوں کو تھام کر
ان کٹھن راہوں پہ چلنے کا ہنر
ایک دن سیکھا تھا تجھ سے میری ماں
جب میں گرتی تھی، تو مجھ کو تھام کر
اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا فن
مجھ کو تجھ سے ہی ملا تھا، میری ماں!
تو ہے اک گہرا سمندر پیار کا
ریگ زاروں میں شجر ہے سایہ دار
کیف آگیں، روح پرور تیری چھاؤں
زندگی کی دھوپ میں سایہ فگن
مجھ پہ بادل سی رہی ہے عمر بھر!
ان اذیت ناک راہوں میں کبھی
تیری شاخوں کی سجل آغوش میں
اپنی ان مجروح آنکھوں کو اگر
موند کر اک پل ٹھہر جاتی تھی میں
تیری چھاؤں ٹھنڈی بارش کی طرح
چوم لیتی تھی مرا جلتا وجود
زندگی کے دور کتنے آچکے

گردش دوراں سے جی بیزار ہے
آبلہ پائی ہے اور لمبا سفر
جاں بلب ہوں، اب تھکن سے چور ہوں
دیکھ اک بوسیدہ پیکر میں چھپی
ہوں وہی ننھی سی بچی آج بھی
پھر سے میری انگلیوں کو تھام کر
جلتی پیشانی کو میری چوم کر
ایک لوری پھر سنا دے مجھ کو، ماں
اپنے آنچل میں چھپا لے مجھ کو، ماں
اپنی بانہوں میں سلا لے مجھ کو، ماں!

---

* ابھی چند روز قبل ان کی والدہ کا کراچی میں انتقال ہوا ہے!

❁❁

Address:
126 Vineland Crescent
Winni Peg R3Y IT6
Mani To Ba (Canada)

بزم سخن ویران ہوئی ☆۱

نجم عثمانی

ایک نئے اسلوب کا خالق
جس کا لہجہ دل کش تھا
جس کے تخیئل کی پروازوں کی
حدیں ہی نہیں تھیں
جس کے قلم نے اک پل رک کر
کبھی نہیں آرام کیا
اس نے جدید غزل میں اپنی
ایک نئی پہچان بنائی
غزلوں کا اک تاج محل سا
یادگار ذیشان بنائی
حیف! کہ فکری ہو گئے رخصت
بزم سخن ویران ہوئی
زیست ہوئی تھی مشکل شاید
موت مگر آسان ہوئی!

❁❁

Address:
New Colony, Wassepur
Dhanbad (Jharkhand) India

یہ موسم شرار کیسے ہوا ☆۲

شمس فریدی

ہوائے وقت کا اس پر یہ دار کیسے ہوا
اسی کا دست ہنر خوں فگار کیسے ہوا
حصار شب میں وہ اکثر صدا تو دیتا تھا
سکوتِ خواب کا آخر شکار کیسے ہوا
وہ لفظ لفظ میں خوشبو بکھیرنے والا
اسی کا آج بدن تار تار کیسے ہوا
دہکتی آگ میں تپ کر ہوا تھا کندن
رتوں کی دھوپ میں پھر زیر بار کیسے ہوا
خوشی میں رہتا تھا وہ بحر پُر سکوں کی طرح
درونِ دل یہ مگر انتشار کیسے ہوا
پڑا ہوا وہ تہہ خاک رو رہا ہوگا
یہ شہر اس کے لیے اشک بار کیسے ہوا

❁❁

Address:
Mohd, House G,S. Road Jharkhand
Jamshed Pur 931006
(India)

☆۱ ☆۲ پرکاش فکری کے لیے

نانی کا گھر

جینت پرمار

وہ دن کیسے یاد آتے ہیں
مل کی فصیل سے لگی ہوئی
اک گندی چال
چال میں
گوبر مٹی کا چھوٹا سا گھر
چھت پر نلیے لال رنگ کے،
مٹی کی دیواروں پر رنگوں سے کھینچے تھے کردار
رامائن اور مہابھارت کے کردار
ہرن کے پیچھے بھاگتے رام،
کہیں سویمبر سیتا کا،
کہیں پہ رادھا اور گھنشیام
نانی کی دونوں کی آنکھیں تھیں
اندھا کنواں
انگلیاں تھیں اس کی آنکھیں
کانوں سے پہچانتی سورج، چاند، ستارے
نانا روز سنایا کرتے کبیر کے پد
سنتے سنتے سو جاتا میں

مل کی چمنی صبح کو جلدی اُٹھ جاتی
اور مرے چھٹی کے دن پورے ہوتے
آج وہاں پر
آسمان کو چھوتی عمارتوں کا جنگل
مذاق اُڑاتا ہے میرا
تیرا بچپن
میں نے دفن کیا ہے
اپنے پاؤں تلے!
لیکن اس کو کیا معلوم
میرا بچپن
مری نظم کے
ایک اک لفظ میں زندہ ہے!

❁❁

Address:

طول دور جدائی

کاوش عباسی

کبیتیں تھک گئی ہیں
گانے پرانے دُکھوں کی طرح حسیت کھو چکے ہیں
میری فغاں اپنے ہی زور سے ہار کر بے صدا
ہوگئی ہے
فرقت کسی مستقل نا اُمیدی و پژمردنی کی طرح
دل کو کھانے لگی ہے
جو درد تیرے طلب گار، تیری محبت میں سرشار دل
کی تڑپ تھا
وہ اب جان کا روگ بننے لگا ہے
افکار ماؤف، احساس کلفت زدہ
طبع وحشی و بیزار
ہونے لگی ہے
اب چلی آؤ
میں تنہا جھلا گیا ہوں!

❁❁

Addres.::
312 Mehran Apartment
Plot 12 STI, Bath Island
Clifton, Karachi.

خالی آدمی

سحر علی

کبھی کبھی میں جلدی میں خود کو دفتر چھوڑ آتا ہوں
اور اکثر دفتر کو گھر لے آتا ہوں
دفتر کی بوسیدہ کرسی میں جتنے دیمک ہیں سارے
مجھ سے گھلے ملے ہیں
یہیں تو آکر ان بالوں میں برف پڑی ہے
لوگوں سے کہتا ہوں سر اُٹھانے کی فرصت نہیں
دل میں کہتا ہوں سر اُٹھانے کی اجازت نہیں
پرانی فائلوں پر دستخط کرتے کرتے
عینک جیب میں اور رومال آنکھوں پہ رکھ لیتا ہوں
بجی ہوئی مسکان کا چہرہ رٹی ہوئی باتوں کا گھیرا
دل پہ اکثر تنگ پڑ جاتا ہے
وقت کی بستی سانس کی گنتی کب سنتی ہے
گھر سے دفتر آتے جاتے رستے میں خرچ
ہو جاتا ہوں
ردّی ہوتے ہوئے وجود کو ضدی بیوی نہیں مانتی
ناکامی کے سارے کارن بھی گنا کر تھک جاتی ہے
گھر کی راحت، ہر پل کی صحبت سے مل کر
بے رونق سی ہو جاتی ہے
دُکھ کی ہتھیلی پہ نیند کی گولی لینی پڑتی ہے
رات گئے میں تان کے چادر نیند میں جا کر
میں تو جیسے مر جاتا ہوں

❁❁

Address:
R-166, 15 A3 Buffer Zone North Karachi.

شیر دریا کی پیاس

فہیم شناس کاظمی

جنم جنم سے
بہتے سندھو کے سینے پر
دو پھول کھلا ہے
تدبیروں کو روندنے والی
حیرانی کا
سندھو کے عریاں سینے پر
ناچے گہری پیاس
ہوا میں وہ بارودی لہر ہے
جس سے جلے احساس
جسموں میں وہ پیاس بسی ہے
ترخ کے پگھلے ماس
دن عاشورے جیسے دن ہیں
شام غریباں جیسی شامیں
برگ و شجر کھیتوں کی فصلیں
اونچی کر کر روئیں بانہیں
چاندی جیسے ابر نہ برسے
لوہے جیسی مٹی پر
سندھو کی رگ رگ سے خوں کو
جو چوری ہر آنگن پر برسیں ڈھیر وا سوگ
سندھو تو ابدی سچا
سندھو تیری پیاس ہے
کربل جیسی پیاس
لکھ دے دھرتی کے سینے پر
جینے کا اتہاس!

Address:
Lecturer Medu
S. M. College (AAS/Com)
Karachi : 1

قطعات

یعقوب تصوّر

(۱)

مری فطرت میں جزءِ ضبط بڑھتا جا رہا ہے
مرا اس بے وفا سے ربط بڑھتا جا رہا ہے
وہ خود کو ہار دے گا پیار کی بازی میں اک دن
میں اس کو جیت لوں گا خبط بڑھتا جا رہا ہے

(۲)

اماں سے ایک دشتِ بے اماں تک آ گیا ہوں
تیقن سے سرِ وہم و گماں تک آ گیا ہوں
ہوا و آب، موسم سب یہاں آتش بد اماں
میں خوابوں کے تعاقب میں کہاں تک آ گیا ہوں

(۳)

فلسفہ کیا فنِ تخلیق میں ہے
زندگی عرصۂ تحقیق میں ہے
زیست کیا ہے قیام ہے کہ سفر
سانس کیا لحۂ تحریق میں ہے

(۴)

درپیش مصلحت رہی تائید اس نے کی
پھر ایک ایک بات کی تردید اس نے کی
ذکر اپنے حسن و وصف و کمالات کا کیا
اس طرح مری بات کی تمہید اس نے کی

❀❀

(۵)

عزت و توقیر و سیم و زر و الماس و گہر
مہرِ تاباں ماہِ درخشندہ نہ تارا چاہیے
شدتِ طوفاں و گرداب و تلاطم میں فقط
ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا چاہیے

(۶)

نتیجہ خیز جہد و جانفشانی ہوگئی ہے
نظامِ زیست میں پیدا روانی ہوگئی ہے
اُدھر تو زندگی اس کی سہانی ہوگئی ہے
اِدھر صحرا میں ریت اپنی جوانی ہوگئی ہے

(۷)

وفا میں بدگمانی بھی کبھی رنجش بھی ہوتی ہے
پھر اس کے بعد شامِ وصل کی خواہش بھی ہوتی ہے
یہی تو ہے تقاضا اہتمامِ کارِ فطرت کا
کہ جب گرمی زیادہ ہو تو پھر بارش بھی ہوتی ہے

(۸)

بہت چرچا تو ہے دریا دلی کا
کنارے کاٹتا رہتا ہے دریا
سبھی آلائشیں اپنی بہا کر
سمندر پاٹتا رہتا ہے دریا

❀❀

Address:
Post Box # 4628, Abu Dhabi (U.A.E.)

سیّد کی حویلی

شفیع مشہدی

''بہو۔اری او بہو'' آواز تیز تھی۔

''جی بیگم صاحب!'' آواز کمزور تھی۔

''میں پوچھتی ہوں تمہاری بکریاں آنگن میں کیوں آئیں'' آواز میں بے پناہ خفگی تھی۔

''کیا کریں بیگم صاحب غلطی ہوئی۔'' آواز میں معذرت تھی۔

''مگر غلطی ہوئی کیوں؟ دیکھو تمہاری بکریوں نے گل داؤدی کا کیا حشر کیا ہے۔اتنی محنت سے میں نے پودے لگائے تھے سب کتر گئیں،کم بخت۔''

''کیا کریں بیگم صاحب جناور تو جناور ہی ہے نا!'' بہو نے معذرت کے انداز میں کہا۔

''بکریاں تو جانور ہیں مگر تم کیا ہو؟ تم تو جانور نہیں ہو،بکریوں کو باندھ کر کیوں نہیں رکھتیں؟''

''باندھتی ہوں بیگم صاحب غلطی سے کھل گئیں۔''

''بکریاں نہیں سنبھال سکتیں تو کمرہ خالی کردو۔ میں تمہاری بکریوں کے لیے گل داؤدی برباد نہیں کر سکتی۔'' بیگم صاحب کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔بیگم صاحب اور بہو کی نوک جھوک نئی نہیں تھی۔ ہفتے میں دو ایک بار ضرور بکریوں یا مرغیوں کو لے کر تنازع کھڑا ہوتا تھا اور اس کا اختتامیہ عموماً ''کمرہ خالی کردو'' پر ہوتا مگر بہو بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اس دھمکی میں کوئی دم نہ تھا اس کا بہترین علاج خاموشی تھا اور واقعتاً چند گھنٹوں بعد ہی بیگم صاحب بہو کو آواز دے کر رات کا بچا ہوا سالن، بچی ہوئی روٹیاں اور بچوں کے لیے مٹھائیاں دیتے ہوئے بڑی محبت سے باتیں کرتی نظر آتی تھیں۔دراصل ان کا مزاج ہی ایسا تھا اوپر سے ناریل کی طرح سخت اور اندر میٹھا پانی۔

پرانی دہلی کے کوچہ چیلان اور تیراہا بہدام خان سے آتی سڑک کے تراہے پر کھڑی یہ پرانی حویلی سیّد کی حویلی کے نام سے جانی جاتی تھی، جو بیگم صاحب اور بہو کی آوازوں سے بے حد مانوس تھی۔ان آوازوں کو اس کی بوسیدہ دیواریں اس طرح جذب کر لیتی تھیں کہ باہر آواز تک نہیں جاتی تھی اور جاتی بھی کیسے کہ وسیع راہداری کے باہر لکڑی کا بلند پھاٹک ہمیشہ بند رہتا تھا، جس نے اندر کی بچی کھچی رونقوں کو باہر جانے سے روک رکھا تھا۔پھاٹک میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جس سے جھک کر اندر داخل ہونا پڑتا تھا۔گویا ہر شخص یہیں سے بیگم صاحب کو کورنش بجانے کی شروعات کرتا تھا۔ جھکے ہوئے اندر داخل ہو کر سر اٹھاتے تو منظر عجیب تھا۔دو رویہ کمروں میں بہو کا خاندان آباد تھا۔یہ لوگ پیشے سے بھنگی تھے اس لیے کوڑے کا ٹوکرا، بکریاں، بچے بلکہ کبھی تو بیل بھی دکھائی دیتے

تھے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کوڑے کے ٹوکرے اور بچوں میں زیادہ گندا کون تھا۔ تقریباً روز ہی بیگم صاحب اور بہو کے مکالمے گونجتے تھے مگر بہو نے کبھی بیگم صاحب کے آگے زبان نہیں کھولی تھی ورنہ دلی کی بھنگن جسے عرفِ عام میں جمعدارن کے لقب سے مخاطب کیا جاتا ہے اتنی تیز ہوتی ہے کہ کوئی کچھ بدل دے تو لکھنؤ کی بھنگن کی طرح اتنا کہہ کر اکتفا نہیں کرتیں کہ ''اتنی قمچیاں ماروں گی کہ چہرے پر سنہرے اُگ آئیں گے بلکہ واقعتاً سنہرے اگا دیتی تھیں۔ مگر بیگم صاحب کی یہ امت دیگر امتوں سے زیادہ وفادار تھی۔

راہداری سے گزر کر آگے بڑھیں تو حویلی کا دروازہ تھا جس پر حویلی جتنی ہی پُرانی تختی لگی تھی جس پر ''بیگم بے خواجہ'' لکھا تھا اور اسے وہی لوگ پڑھ سکتے تھے جنہیں معلوم تھا کہ بیگم صاحب یہیں رہتی تھیں۔ تختی پر لکھا بیگم تقریباً مٹ چکا تھا مگر ''خواجہ'' کے آثار خاصے واضح تھے۔ ان کا نام جو بھی رہا ہو مگر سارا شہر اور اہلِ زبان بھی انہیں بیگم صاحب ہی کہتے تھے بلکہ ''صاحب'' بھی ''بیگم صاحب'' میں تبدیل ہو چکا تھا۔ حویلی کے اندر داخل ہوتے ہی بڑا سا آنگن دکھائی دیتا تھا، جس پر خوشنما پھولوں کے گملوں کی قطاریں تھیں۔ آنگن کے تین جانب کمروں اور برآمدوں کا سلسلہ تھا۔ شمالی حصے میں برآمدے سے ملحق ایک بڑا سا سہ درا تھا جسے خوب صورت ستونوں اور منقش محرابوں نے سنبھال رکھا تھا۔ بیگم صاحب بتاتی تھیں کہ یہ سیّد صاحب کی بیٹھک تھی جہاں وہ لوگوں سے ملتے تھے اور اس کے متصل کمروں میں ان کا آفس اور بیڈ روم تھا۔ یہی حصہ بیگم صاحب کا مسکن تھا۔ بقیہ حصوں میں لکھنؤ کے محمود صاحب بدایوں کے ضیاء صاحب مغربی یوپی کے رئیس اور رشید صاحب اور بہار کے بدیع صاحب بحیثیت کرایہ دار مقیم تھے۔ اس حویلی کی کل آبادی ان ہی دانشوروں، بیگم صاحب، جگدیش بلنگی کے خاندان اس کی بکریوں اور مرغیوں پر مشتمل تھی۔ اچھا خاصا چھوٹا موٹا ہندوستان تھا جو سیکولر ضرور تھا مگر جمہوریت نہیں تھی۔ بیگم صاحب اس ملک کی مطلق العنان حاکم تھیں اور ان کا ہر فیصلہ حرفِ آخر تھا جس کے آگے سارے مکین سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔ بکریوں اور مرغیوں کو چھوڑ کر باقی سارے مکین بے حد سعادت مند تھے اور بیگم صاحب کے نیاز مند تھے، اس لیے ماحول بھی خوشگوار تھا۔ بیگم صاحب تنہا تھیں۔ ڈاکٹری پڑھتے پڑھتے خدا جانے کیا سانحہ ہوا کہ انہوں نے پڑھائی چھوڑ دی تھی اور ساری زندگی مجرد رہ گئیں۔ ان کے سارے عزیز و اقارب سرحد پار کر چلے تھے مگر حویلی کے آنگن نے ان کے پاؤں تھام رکھے تھے۔ وہ واقعتاً تنہا تھیں ان کے خاندان کا کوئی فرد دلی میں نہیں تھا اس لیے انہوں نے کرایہ داروں کو ہی اپنا خاندان بنا رکھا تھا اور خود اس کی سربراہ بن بیٹھی تھیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ باہر برآمدے کا بلب دس بجے رات کے بعد جلتا کیوں رہ گیا، بچہ کیوں رویا، وغیرہ وغیرہ۔ سویرے اٹھتے ہی وہ ہاتھ میں نوٹ بک لیے بجلی کا میٹر نوٹ کرتیں پھر اسے سارے کرایہ داروں میں منصفانہ انداز میں تقسیم کرتیں اور اکثر پکار کر کہتیں۔

''محمود صاحب! آپ کا ایک بلب دو بجے رات تک جل رہا تھا اس لیے ایک یونٹ زیادہ ہوا۔'' اور لکھنوی

تہذیب کے مرقع محمود صاحب ''جی بیگم صاحب'' سے زیادہ کچھ کہہ نہیں پاتے تھے۔ حالانکہ آواز میں مظلوم کے احتجاج کی دھمک ضرور ہوتی تھی۔ البتہ جب بیگم صاحب اپنی دوست طاہرہ بیگم کے یہاں گئی ہوتیں تو حویلی میں چہل پہل ہوجاتی تھی۔ بچے دوڑتے کھلکھلاتے رہتے اور محمود صاحب وغیرہ بھی آنگن میں مونڈھے ڈال کر آزادی سے خوش گپیاں کرتے اور قہقہے لگاتے جیسے ساری حویلی ان ہی کی ہو۔ موضوع سخن زیادہ تر بیگم صاحب کی زیادتیاں ہوتیں اور محمود صاحب تو یہاں تک کہہ جاتے کہ بیگم صاحب کا خاندانی تعلق نادر شاہ سے رہا ہوگا۔ حالانکہ یہ الزام تھا۔ ان کا تعلق تو پرانی دلی کے شرفاء سے تھا۔ مزاج میں سلطانیت ضرور تھی مگر شرافت میں کوئی کمی نہیں تھی۔

''یاران بیگم صاحب نے تو جینا دوبھر کردیا ہے۔ کل شام کو میرے دوست موہن سنگھ آئے تھے۔ جانے لگے تو بیگم صاحب کے گملے سے ٹھوکر لگی اور بے چارے گرتے پڑتے بچے اور جانتے ہیں بیگم صاحب کیا فرماتی ہیں۔ ''آپ کے دوست نشے میں تھے۔ کیسے کیسے لوگوں سے دوستی کررکھی ہے آپ نے۔ میں فاخرہ بیگم سے کہوں گی۔'' یار جی تو چاہا کہ کھری کھری سناؤں کہ قصور تو راستے میں رکھے گملوں کا تھا اور آپ نے ایک شریف آدمی پر الزام لگا دیا مگر......''

''مگر کیا! آپ کو کہنا چاہیے تھا۔'' رشید خان صاحب نے پوری متانت سے کہا۔

''آپ ڈر کیوں گئے؟ کہہ دینا چاہیے تھا۔'' ضیاء صاحب نے اپنی حسرتوں کا اظہار کیا۔ محمود صاحب کو غصہ آگیا۔

''میں کیوں ڈروں گا۔ قسم خدا کی ایک دن جنگ ہوجائے گی۔ آپ مجھے نہیں جانتے میں نے اچھے اچھوں کی بولتی بند کردی ہے۔ میں کوئی بدایوں کا للا ہوں کیا۔'' محمود صاحب نے ضیاء صاحب کے وطن پر وار کیا تھا۔

''نہیں بھائی آپ تو لکھنؤ کے بانکے ہیں۔ مگر ذرا بانکپن دکھایئے تو ہم جانیں'' ضیاء صاحب کب چپ رہنے والے تھے۔ مگر سب لوگ جانتے تھے کہ بیگم صاحب کے آتے ہی منظر بدل جائے گا اور لوگ کمروں میں چلے جائیں گے۔ کس کی مجال تھی کہ بیگم صاحب کے سامنے منہ کھولتا۔

بظاہر سخت گیر بیگم صاحب کے اندر بے حد دردمند دل تھا۔ دوسروں کے دُکھ دَرد میں شریک ہونا اور اس کے دَرد کو اپنا دَرد بنالینا ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ آزادی کے وقت جو فسادات ہوئے تھے اس کے ریلیف کیمپ میں مہینوں بغیر کھائے پیے وہ لوگوں کی خدمت کرتی رہی تھیں اور جن بزرگوں نے دیکھا تھا وہ آج بھی ان کے قدردان تھے۔ ایسے سارا محلّہ ہی ان کا نیازمند تھا۔ جگدیش بھنگی سے لے کر ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے آئے ہوئے رائے بہادر صاحب تک۔ سرحد پار سے لٹے لٹائے رفیوجی بن کر آئے لوگوں سے محلّہ آباد تھا، شرفاء محلّہ چھوڑ کر جاچکے تھے اور ان کے مکانات کسٹوڈین نے انہیں الاٹ کردیے تھے۔ بس یہی ایک پُرانی حویلی بچی تھی جیسے بیگم صاحب راولپنڈی کے سردار جواہر سنگھ ہوں یا جھنگ کے کشمیری لال سہگل، کوہلی صاحب ہوں یا لکڑی ٹال والا

نارائن، سبھی بیگم صاحب کو دیکھتے ہی کھڑے ہوکر دونوں ہاتھ جوڑ دیتے اور بیگم صاحب ان سے ایسے خیریت پوچھتیں جیسے ان کا اپنا کنبہ ہو۔ ایک دن میں ان کے ساتھ حکیم مومن خاں کی گلی سے گزر رہا تھا تو سردار جواہر سنگھ مل گئے۔ وہ آگے بڑے تو بیگم صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ ''تم ان کے گھر گئے تھے۔''

''جی ہاں! سردار جی بیمار تھے تو انہیں دیکھنے گیا تھا۔'' سردارنی مجھے اندر لے گئیں جہاں ایک بڑے کمرے میں سردار جی لیٹے ہوئے تھے سامنے منقش دیوار پر بابا نانک کی تصویر لگی تھی، جس پر پھول کے ہار تھے اور اس کے اوپر کمرے کے چاروں طرف قرآنی طغرے کے ٹائلس لگے ہوئے تھے۔ میں تو حیران تھا۔ سردار جی نے میری حیرت کو محسوس کیا بولے۔ ''جانتے ہو بیٹے یہ کس کا مکان تھا؟ یہ علامہ راشد الخیری کا مکان تھا۔ میں نے سب کچھ ویسے ہی رہنے دیا ہے۔ بڑی برکت والا مکان ہے۔ واہگورو کی کرپا اور علامہ کی دعا بھی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے سردار جواہر سنگھ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ اسّی سال کے بوڑھے سردار کو شاید اپنا گاؤں یاد آ گیا تھا، نہ جانے اس کے مکان میں ننگے بابا نانک کی فوٹو کا کیا ہوا ہوگا مگر اس نے اپنے زخموں پر قرآنی آیات کا مرہم لگا رکھا تھا۔

حویلی میں رہنے والے تمام لوگوں کی گارجین بیگم صاحب تھیں۔ کوئی بیمار پڑے تو ڈاکٹر کو بلا کر دکھانا، دوا لانی، پابندی سے کھلانی اور تیمارداری کرنی، بیگم صاحب کے خود اختیاری فرائض میں تھے۔ اس قدر شفقت اور محبت تھی کہ زبان کی سخت کلاسی کو لوگ کڑوی دوا سمجھ کر پی جاتے تھے۔

سیّد کی حویلی کافی پرانی ہو چکی تھی اور اس کا ایک حصہ جس میں ضیاء صاحب رہتے تھے، خاصا خستہ حال بھی تھا۔ مگر پھر بھی اس کی ایک شان تھی۔ بھائی جان اور رشید صاحب کو میں نے حویلی کی داستان سناتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ تاریخی مکان ہے مگر بیگم صاحب کے بعد نہ جانے اس کا کیا حشر ہوگا۔ ایک دن بڑی حسرت سے بھائی جان نے مجھے محرابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''جانتے ہو ان محرابوں کے نیچے بیٹھ کر قوم کی قسمت کے فیصلے کیے گئے تھے اور وہ تاریخی اقدام ہوئے تھے جس نے مسلمانوں کی تقدیر بدل دی تھی'' مگر اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئے اور تب میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ میں نے اتنا ضرور دیکھا تھا کہ شیروانی پہنے ہوئے کچھ لوگ کئی بار بیگم صاحب سے باتیں کرنے آئے تھے، اس حویلی کو سیّد کی یادگار بنانا چاہتے تھے۔ بیگم صاحب راضی بھی نہیں تھیں۔ مگر پھر شیروانی والے لوگ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ شاید ان کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔

حویلی میں رہنے والوں میں مَیں تنہا طالب علم تھا اور سب سے چھوٹا بھی اس لیے بیگم صاحب کی خاص شفقت مجھ پر تھی وہ مجھے بے حد مانتی تھیں۔ بھائی جان کو بھی وہ بے حد مانتی تھیں اور ہمیشہ انہیں کھانے کی ترغیب دیتیں۔ پھر نزلہ بھابھی پر اُترتا۔ ''بھئی دلہن! تم میرے بھائی کا خیال نہیں رکھتی ہو۔ دیکھو کتنے دبلے ہو گئے ہیں۔'' اور میں لقمہ دیتا ''بھابھی کب موٹی'' تو وہ ہنسنے لگتیں۔ ''میں کب کہہ رہی ہوں کہ وہ موٹی ہیں۔ خود بھی کھائیں اور میاں کو بھی کھلائیں۔'' بیگم صاحب کی بے پناہ محبت و شفقت سے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے پچھلے

جنم میں یقیناً ان سے قریبی رشتہ رہا ہوگا۔ بلکہ محمود صاحب تو اکثر مجھ کو چھیڑتے بھی تھے۔ ''میاں! لگے رہو یہ حویلی تمہیں ہی ملے گی اور تو کوئی ہے نہیں اور میں ہنس کر جواب دیتا ''آپ جو ہیں''۔

''میاں! مجھے تو بیگم صاحب وہ بھنگی والا کمرہ بھی نہیں دے گی۔ تمہاری چاندی ہے۔''

تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب ملازمت کے سلسلے میں مجھے دلی چھوڑنی تھی تو سب سے زیادہ مغموم بیگم صاحب ہی تھیں۔ وہ بے چین تھیں میرے جانے کے ایک دن پہلے وہ آب دیدہ ہو کر مجھ سے کہنے لگیں۔

''تم چلے جاؤ گے تو میں تنہا ہو جاؤں گی۔ جلد واپس آ جانا۔ میں یہ حویلی تمہارے نام کر دوں گی۔'' مجھے جھٹکا سا لگا۔

''بیگم صاحب میں اگر واپس آسکا تو آپ کی محبت کے لیے آؤں گا نہ کہ حویلی کے لیے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''نہیں نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میرا اپنا کوئی بھی نہیں۔ لوگ گدھ کی طرح میرے مرنے کے منتظر ہیں ان کا بس چلے تو ابھی قبضہ کر لیں۔ تم تھے تو مجھے تقویت تھی مگر میں تمہیں روک بھی نہیں سکتی تمہارے کیریئر کا سوال ہے۔ جاؤ مگر آ جانا۔'' انہوں نے بڑی لجاجت سے کہا تھا اور آنسو کا ایک قطرہ ان کے جھری دار گالوں پر ٹھہر سا گیا تھا۔ میں بھی ان گدھوں کو جانتا تھا، جو منڈلا رہے تھے۔ چونکہ بیگم صاحب خود اعلا تعلیم یافتہ اور جہاں دیدہ تھیں اور دلی کے ممتاز لوگوں سے ان کے ذاتی مراسم بھی تھے اس لیے کسی کی ہمت نہ تھی کہ حویلی پر قبضہ کر لے مگر لوگ للچائی نظروں سے حویلی کو دیکھ ضرور رہے تھے۔

ملازمت کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ برس دو برس پر میں بیگم صاحب سے ملا ضرور مگر ہر بار مجھے ایسا محسوس ہوا کہ حویلی اور بیگم صاحب دونوں ہی کافی پُرانی اور خستہ ہوتی جا رہی ہیں۔ بھائی جان ضیاء صاحب اور رئیس صاحب سب حویلی سے جا چکے تھے اور ان کی جگہ جو لوگ آئے تھے وہ مخلص نہیں نظر آتے تھے۔ تقریباً پانچ برسوں کے بعد میں حویلی پہنچا تو نقشہ بدلا ہوا تھا۔ آنگن میں چاروں طرف کباڑ پھیلا تھا اور کباڑیوں کی موٹی موٹی عورتیں آنگن میں گھوم رہی تھیں۔ کباڑیوں نے حویلی پر قبضہ کر لیا تھا۔ آنگن میں بڑے بڑے بکرے پیپل کے پتے چبا رہے تھے اور گل داؤدی کے گملے ٹوٹ چکے تھے۔ بیگم صاحب کی کل حویلی برآمدے میں پڑے اس تخت پر سمٹ آئی تھی جس پر نیم مردہ سی بیگم صاحب پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے قبضے میں اس تخت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وہ بیمار تھیں اور ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میری آنکھوں میں وہ منظر گھومنے لگا جہاں پیازی رنگ کا غرارہ پہنے بیگم صاحب حویلی پر راج کر رہی ہوتی تھیں اور گل داؤدی کے پھول سے آنگن بھرا ہوتا تھا۔ مگر اب تو آنگن میں بکرے، پیپل کے پتے چبا رہے تھے اور موٹے موٹے ادھ ننگے بچے شور مچا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بیگم صاحب کی آنکھیں نم ہو گئیں مگر وہ خاموش رہیں۔ آنسو تھمے تو پتہ چلا کہ ان کے ایک عزیز جوان کے

وکیل بھی تھے۔ نے دھوکا دے کر حویلی کباڑیوں کے نام لکھوادی تھی اور کباڑیوں سے آدھی رات کو حویلی پر قبضہ کرلیا تھا۔ بیگم صاحب تنہا اور بیمار تھیں حویلی کا اجڑتے دیکھتی رہیں۔ حویلی کی جو تھوڑی سی قیمت ملی تھی وہ طاہرہ بیگم یہ کہہ کر لے گئیں کہ "تم کہاں رکھو گی غائب ہو جائیں گے" اور واقعی وہ غائب بھی ہو گئے۔ مجھے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ مجھے شدید گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب میں نے اجازت چاہی تو وہ بلک بلک کر رونے لگیں۔ میں بیگم صاحب کی یہ حالت دیکھ نہیں پا رہا تھا اور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "میاں میں نہ کہتی تھی کہ تم مت جاؤ یہ گدھ......" انہوں ں ے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور بڑی حسرت کے ساتھ آنگن میں شور مچاتے ادھ ننگے بچوں اور پیپل کا پتہ چباتے موٹے موٹے بکروں کو دیکھتی رہیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے پتوں کو نہیں بلکہ پوری حویلی کو چبا رہے تھے اور ساتھ میں بیگم صاحب کو بھی۔

چند مہینوں بعد میں پھر بیگم صاحب سے ملنے آیا مگر گدھ کا انتظار ختم ہو چکا تھا۔ سیّد کی حویلی کباڑ خانے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ سہہ درے کے محراب مرثیہ خواں تھے کہ جس حویلی میں قسمت سنوارنے کے فیصلے ہوئے تھے وہ خود اپنی تقدیر نہیں سنوار سکی۔

❀❀

Address:
Editor Smpplement
"Khaleej Times"

گفٹ باکس

نجم الحسن رضوی

اطلاع آئی تھی کہ جہاز ایک گھنٹہ دیر سے آئے گا۔ ان لوگوں کے علاوہ جو لوگ ہوائی اڈے پر گئے ہوئے تھے بہت سے لوگ گھر میں بیٹھے تھے۔ قریبی رشتے دار، دوست اور محلے کے لوگ۔ ماموں کی وجہ سے۔

ماموں سب کے ماموں ہیں۔ برسوں پہلے باہر جانے سے قبل بھی وہ عزیزوں اور دوستوں میں بہت مقبول تھے۔ ہر کسی کو ان سے کوئی نہ کوئی کام رہتا تھا۔ ساری تقریبات کے منتظم، شادی، ولیمے، میلاد محفل اور سالگرہ کی تقریبات کے لیے ہر کوئی ان کی خدمات حاصل کرنا چاہتا۔ بڑے بوڑھے، جوان اور بچے سب ان سے بے تکلف تھے۔

اصل میں تو وہ میرے ماموں ہیں مگر سب چھوٹے بڑے انہیں ماموں ہی کہتے ہیں۔ جب وہ یہاں سے گئے تو میں چھوٹی تھی مگر اتنی پابندی سے وہ ہر سال گھر آتے اور اتنی بہت سی چیزیں تحفے میں لاتے کہ انہیں کبھی بھولنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ جب بھی میرے ذہن میں ان کی شکل دھندلانے لگتی وہ فوراً آ پہنچتے۔ کسی نہ کسی تحفے کے ساتھ۔ مرکزی لاؤنج میں ہر گھنٹے کے بعد کوئل کی طرح کوکنے والا جو بڑا سا کلاک لگا ہے وہ بھی ماموں نے بھیجا تھا اس کا مستطیل ڈبہ اتنا بڑا تھا۔ سرخ رنگ کا خوب صورت نقش و نگار والا کہ بہت دنوں تک اسے کونے میں ٹیلی فون کی میز کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔ جب میری شادی ہوگئی تو میں اس کوکتے کلاک کو اپنے ساتھ ہی اپنے گھر لے آئی۔ اب یہ ہمارے گھر کے لاؤنج میں نصب ہے اور دن رات ماموں کی یاد تازہ رکھتا ہے۔

ایک اور چیز جو اب تک میرے ساتھ ہے، وہ ہے ایک گڑیا، جب بھی اسے چھوؤ وہ بولنے لگتی ہے۔ برسوں سے یہ گڑیا میرے پاس ہے اور میں نے اسے بڑی حفاظت سے اپنے پاس رکھا ہوا ہے اور اب یہ گڑیا میری بیٹی کی بھی سہیلی ہے۔ میری بیٹی نوشین چار سال کی ہے اور اسے بھی ماموں کے تحفوں کا انتظار رہتا ہے۔ بالکل میری طرح ہی وہ بھی تحفے کے ڈبوں کو جمع کرتی ہے۔ میرے پاس ہمیشہ تحفے کے ڈبوں کا پورا خزانہ موجود رہا۔ ٹافی اور چاکلیٹ، نمکین پستوں اور بادامی کھجوروں کے مختلف قسم کے ٹن، پلاسٹک اور گتے کے چھوٹے بڑے ڈبے۔ سینڈلوں اور جوتوں کے بکس۔ خوشبوؤں اور میک اپ کے سامان کے پیکنگ کیس۔ مختلف قسم کے کھلونوں کے ڈبے۔ بعض ڈبے اتنے خوبصورت ہوتے تھے کہ انہیں ہاتھ لگانے کو جی نہ چاہتا کہ کہیں میلے نہ ہو جائیں۔ بی اے کے امتحان میں پاس ہونے پر ماموں نے جو طلائی گھڑی بھیجی تھی، اس کا پھولوں والا ڈبہ اتنا دلکش تھا کہ میں نے بہت دن تک اسے اپنی مسہری کے برابر والی میز پر سجائے رکھا تا کہ صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے اس پر میری

نظر پڑے۔

خوب صورت ڈبے جمع کرنے کا شوق مجھے ہمیشہ سے تھا اور ماموں نے ہمیشہ اس شوق کو پورا کرنے میں میری بھرپور مدد کی۔ میرے کمرے کی ایک پوری الماری صرف ان ڈبوں سے بھری ہوئی ہے، جو میں نے برسوں سے سنبھال کے رکھے ہوئے ہیں۔ بعض پر اب بھی آپ کو گلابی یا کاسنی ربن بندھا ہوا ملے گا۔

ماموں جب بھی وطن واپس آتے پورا ایک سوٹ کیس تحائف کے رنگ برنگے ڈبوں سے بھرا ہوتا۔ میری سالگرہ یا عید، بقرعید یا کسی اور خوشی کے موقع پر اگر وہ خود نہ آپاتے تو بھی کوریئر سروس کا ملازم صبح صبح گھر کی گھنٹی بجاتا نظر آتا اور پھر تروتازہ گلابوں سے بھرا گلدستہ اور ساتھ ہی چمکتے رنگ برنگے کاغذوں میں لپٹا ہوا تحفے کا ڈبہ سامنے موجود ہوتا۔ ایک دفعہ میرے چھوٹے بھائی کو جس کی عمر بارہ سال تھی اس کی سالگرہ پر پوری ایک سائیکل ڈبے میں بند کر کے بھیجی تھی، جس پر خوب صورت تتلیاں بنی ہوئی تھیں، جیسے سائیکل ہوائی جہاز سے نہ آئی ہو بلکہ تتلیاں اسے اپنے ساتھ اڑا کے لائی ہوں۔ بہت دنوں تک وہ تتلیاں ہمارے گھر کی عقبی بالکونی میں جو دبیز پردوں کی وجہ سے اندھیری سی رہتی تھی اپنے پروں کا اجالا بکھیرتی رہیں۔

اماں کہتی ہیں کہ ماموں کے تحفے صرف ہمارے لیے ہی نہیں آتے بلکہ ان کو سب لوگوں کی سالگرہ اور سب کی زندگی کے اہم دن یاد رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہمارے گھر کا مالی چپکے چپکے اماں سے کچھ کہہ رہا تھا اور روتے ہوئے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے دعائیں دے رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''مالی چاچا کو کیا ہوا اماں۔ وہ رو کیوں رہے تھے۔''؟

اماں نے جواب دیا۔ ''ماموں کو دعائیں دے رہے تھے کہ انہوں نے اس کی بیٹی کے لیے جو حال ہی میں گاؤں میں بیاہی گئی تھی شادی کے جوڑے کا پارسل بھیجا تھا'' تو ماموں کے پارسل سب کے لیے ہیں۔ میں نے سوچا۔

''اچھے ماموں۔'' میں نے انہیں خط لکھا، ''آپ بہت دنوں سے آئے نہیں۔ آپ کو دیکھنے کو بڑا جی چاہتا ہے۔ مجھے اس مہینے ایک اسکول میں ٹیچر کی نوکری مل گئی ہے۔ اس بار آپ آئیں گے تو آپ کی دعوت میری طرف سے۔''! اور ماموں آ گئے۔

سوٹ کیس ایک طرف رکھتے ہوئے، پیار سے بولے۔ ''میں صرف تمہاری دعوت کھانے آیا ہوں۔'' دعوت انہوں نے کھائی، تحفہ مجھے ملا، کانوں کے خوب صورت ٹاپس۔ اور وہ سرخ رنگ کے جس مخملیں ڈبے میں بند تھے اس پر لکھا تھا: ''اپنی لاڈلی بیٹی کے لیے۔'' یقیناً میں ان کی لاڈلی بیٹی تھی۔ اماں کہتی ہیں۔ ''وہ تمہارے ماموں ہی نہیں باپ بھی ہیں۔'' جب ابا کا انتقال ہوا تو میں بہت چھوٹی تھی۔ مجھے نہیں معلوم ابا لوگ کیسے ہوتے ہیں مگر یہ ضرور پتہ ہے کہ ماموں کون ہیں اور کیسے ہوتے ہیں اور ہمارے ماموں تو سب کے ماموں ہیں۔ جس لڑکی سے ان

کی شادی طے ہونے والی تھی وہ بھی انہیں ماموں کہتی تھی۔ اماں نے یہ رشتہ ماموں کی غیر موجودگی میں طے کر دیا تھا۔ اس سال جب وہ رخصت پر آئے تو انہیں بتایا گیا۔

''بڑی اچھی لڑکی ہے وہ خوب صورت اور خوش اخلاق۔'' اماں بولیں۔

''بس ایک خرابی ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیا۔؟'' ماموں نے پوچھا۔

''وہ بھی آپ کو ماموں کہتی ہے۔''! میں ہنسی۔

ماموں کے ہونٹوں پر ایک اُداس مسکراہٹ اُبھری۔ ''مگر آپا'' انہوں نے اماں سے شکایتاً کہا۔'' آپ نے مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔ ابھی میں شادی نہیں کر سکتا!''

''کیوں'' اماں تنک کے بولیں۔'' ابھی اور کتنا انتظار کرو گے۔ پردیس کی دھوپ میں آدھا سر سفید ہو گیا، آخر وہ وقت کب آئے گا؟''

''اللہ جانے کب آئے گا۔'' ماموں نے کہا اور پھر میری طرف مڑے اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کے پیار سے بولے۔'' مجھے اپنی بیٹی کی شادی کرنی ہے۔ آپ دیکھتی نہیں۔ اب تو یہ اُستانی ہو گئی ہے۔ پہلے اس کے لیے تو دولہا لے آؤں تا کہ یہ اسے بھی سبق پڑھا سکے۔''!

پھر میری شادی کے لیے انہوں نے تحفوں کی ٹرین چلا دی۔ ڈبے ہی ڈبے۔ زیورات، کپڑے لتے، الیکٹرونکس کا سامان، گرہستی کی اشیاء۔ سجاوٹ کی چیزیں۔ میرے نئے گھر میں تحائف کے رنگ برنگے ڈبوں اور صندوقوں کا ڈھیر لگ گیا۔

میرے لیے ڈبوں اور پارسلوں کا سلسلہ اس کے بعد میں بھی جاری رہا اور خوب صورت ڈبوں کو جمع کرنے کے میرے شوق کے احترام میں میرے شوہر کو ان کے لیے کوئی کمروں میں شیشے کی الماریاں بنوانی پڑیں۔ اماں کا خیال تھا کہ میری شادی کے بعد ماموں اپنا گھر بسانے کے لیے راضی ہو جائیں گے مگر وہ ہر بار یہی کہتے کہ وہ بس اگلے سال واپس آجائیں گے تب شادی کریں گے۔. جس لڑکی سے ماموں کا رشتہ طے ہوا تھا وہ تقریباً ہر ہفتے فون پر مجھ سے ماموں کی خیریت پتہ کرتی تھی مگر ماموں کو شادی کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ آخر ایک بار اماں نے چڑ کے ان سے کہا کہ'' وہ تمہارے بارے میں اس قدر فکر مند رہتی ہے مگر تمہیں ذرا اس کی فکر نہیں۔''

ماموں نے کہا۔'' نہیں مجھے اس کی بہت فکر ہے'' آپ اس لڑکی کی شادی کہیں اور کرا دیں۔ میں شاید ابھی اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔!

''کیا''؟ رنج اور مایوسی کے ملے جلے جذبات کے زیر اثر اماں کی آواز رندھ گئی۔'' کل اس بے چاری کی سالگرہ ہے اور تم نے اس خوشی کے دن اسے یہ تحفہ دینے کا ارادہ کیا ہے؟''

اور حسب معمول ماموں کی منگیتر کو اپنی سالگرہ کے دن فضائی قاصد کے ہاتھوں سرخ ڈبے میں نہایت خوب صورت ساڑی کا تحفہ ملا اور ایک خط بھی۔ ان کی منگیتر۔ نے بعد میں بتایا۔ خط میں لکھا تھا: ''سالگرہ مبارک۔ یہ ساڑی تم پر خوب سجے گی۔ تم اسے ضرور پہننا۔ مگر اپنی شادی کے دن۔ جو انشاء اللہ بہت جلد آئے گا۔ مگر مجھے آنے میں دیر لگے گی۔ اس لیے میرا انتظار نہ کرنا۔''!

میں نے بگڑ کے اماں سے کہا۔ ''کیسے کٹھور دل ہیں ماموں؟''

اماں نے بتایا۔ ماموں نے رشتہ ختم کر دیا تھا اور اپنی منگیتر کے والدین سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کی شادی کہیں اور کر دیں۔

مجھے اس دن ماموں پر غصہ آیا۔ جی چاہا ان سے فون پر ہی لڑ پڑوں یا پھر ملامتوں بھرا ایک کئی میل لمبا ایک خط انہیں لکھ ماروں یا پھر کچھ نہ کروں اور خوب روؤں مگر میں نے کچھ نہ کیا بس ان کے دیے ہوئے تحفوں کے ڈبوں سے بھری ہوئی الماری کے پٹ کھول کے دو ایک بار زور سے بند کیے۔ ماموں کے منگیتر کی شادی ہو گئی۔ میرا چھوٹا بھائی بھی مزید پڑھنے کے لیے ملک سے باہر چلا گیا۔ یہ بھی ماموں کی خواہش تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ لڑکوں کو باہر ہی جانا چاہیے۔ باہر رہ کے لڑکے اگر وقت بھی ضائع کریں تو بھی کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں۔ یہاں تو سکھا سکھایا بھی ضائع ہو جاتا ہے۔

ماموں نے لکھا تھا کہ وہ اگلے سال واپس آ جائیں گے اپنا کام سمیٹ کے۔ اماں بہت خوش تھیں۔ مگر میرے شوہر نے مذاق ہی مذاق میں مجھے رلا دیا۔ مسکرا کے کہنے لگے۔ ''تمہیں تو ان کے آنے کی کوئی خوشی نہیں ہوگی۔ تحفوں کے ڈبے کہاں سے آئیں گے۔''

اسی وقت میری بیٹی نوشین بیچ میں کود پڑی۔ ''امی، امی'' وہ اٹھلا کے بولی۔ ''ماموں ہمارے لیے بڑا سا گڈا لائیں گے نا۔ سوتا جاگتا۔ اتنا بڑا والا۔'' اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے۔

اور اب اتنے دنوں کا انتظار ختم ہوا۔ اماں کا انتظار۔ میرا انتظار، میری بچی کا انتظار۔

ماموں آج آ رہے ہیں۔ ہوائی اڈے پر جو لوگ انہیں لینے گئے تھے ان کا فون آیا ہے کہ پرواز ایک گھنٹے کی تاخیر سے پہنچی ہے اور یہاں گھر میں سارے عزیز، دوست، محلے والے ان کے منتظر ہیں۔

جس جس کو ماموں کے آنے کا پتہ چل رہا ہے وہ آ رہا ہے، فون کی گھنٹی بار بار بج رہی ہے۔

اماں کے کمرے میں محلے کی عورتیں آ جا رہی ہیں۔ اچانک میں دیکھتی ہوں، ماموں کی سابقہ منگیتر بھی آنے والوں میں شامل ہے۔ وہ چپکے سے اماں کے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ اچانک گیٹ سے باہر گاڑیاں آ کے رکتی ہیں۔ لوگ اندر آ رہے ہیں۔ سامان اُتارا جا رہا ہے۔

اماں کے کمرے میں آوازوں کی بھنبھناہٹیں تیز ہو گئی ہیں۔

اتنے میں ماموں کی سابقہ منگیتر میرے پاس آتی ہے اور سسکیاں بھرتی مجھ سے لپٹ جاتی ہے۔
''مجھے پتہ تھا۔'' اس نے کہا۔ ''ماموں نے خط میں لکھا تھا، تم شادی کر لو میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا کیونکہ مجھے کوئی اپنے ساتھ لے جانا والا آ گیا ہے۔''

مجھے کینسر ہو گیا ہے۔!

صحن میں ایک بڑا سا مستطیل ڈبہ رکھا ہے۔ سادہ لکڑی کا لمبا سا ڈبہ۔ جس پر سفید چادر لپٹی ہوئی ہے۔! ماموں نے آج عجیب تحفہ بھیجا ہے ہم سب کے لیے۔

مگر میں اپنی بیٹی کو کیسے بتاؤں کہ اس ڈبے میں بڑا سا گڈا بند ہے۔ جو پہلے سوتا جاگتا تھا اب صرف سوتا ہے۔ وہ حیران حیران میرے پاس آتی ہے اور پریشان ہو کے مجھ سے پوچھتی ہے۔ ''امی! آپ رو کیوں رہی ہیں۔''؟

❁❁

Address:
Editor Smpplement
"Khaleej Times"
Post Box # 11243
Dubai (U.A.E.)

کرب شناسائی

شاہین نظر

اس دن وہ میرے اتنے قریب کھڑی تھی کہ میں چاہتا تو اسے چھو سکتا تھا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ بھرے بازار میں کھڑے ہونے کے باوجود میرا دل بھی یہی چاہا کہ اسے چھولوں مگر میں ایسا نہیں کرسکا۔ میری روایتی بزدلی میرے آڑے آئی۔ یہاں تک کہ ہر روز کی طرح ایک بس آکر رکی اور وہ اس میں سوار ہوکر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

میں بہت دیر تک اس کے وجود کی خوشبو محسوس کرتا رہا۔ کاش اس کی بس ذرا دیر سے آئی ہوتی تو آج اس سے راہ ورسم کی ابتدا ہوگئی ہوتی۔ مگر میں اس سے کیا کہتا۔ اس سے کس طرح مخاطب ہوتا۔ اسے ''ہیلو'' کہتا یا سیدھے سیدھے اس کا نام پوچھ لیتا جیسا کہ فلموں میں ہیرو کرتے ہیں۔ مگر یہ فلم نہیں حقیقی زندگی کا معاملہ تھا۔ اس نے مجھے نظر انداز کردیا ہوتا، مجھے جھٹک دیا ہوتا تو میری کیا وقعت رہ جاتی۔ یہ خیال آتے ہی جیسے میں ہوش میں آگیا۔ پتہ نہیں مجھ پر یہ دیوانگی کیوں طاری ہوگئی ہے۔ میں ایک عزت دار شخص ہوکر کسی اجنبی لڑکی میں اس قدر دلچسپی لے رہا ہوں۔ توبہ توبہ۔

مگر وہ ہے کون؟

کہاں جاتی ہے؟

کیا کام کرتی ہے؟

کبھی کبھی اس کے ساتھ ایک دو افراد بھی ہوتے ہیں۔ تو مجھے کیا۔ میں نے اس کے خیال کو ذہن سے جھٹکا۔ کس دیس کی رہنے والی ہے آخر وہ؟ آج تو وہ اپنے پہناوے سے لکھنؤ وغیرہ کی لگ رہی تھی۔ چکن کا کڑھا ہوا کرتا اور چوڑی دار پاجامہ اور ایک بڑا سا دوپٹہ اس پر اس طرح جچ رہا تھا کہ آنکھیں ہٹائے نہیں ہٹتی تھیں۔ اچھا ہوا وہ چلی گئی ورنہ میں تو پاگل ہی ہوجاتا۔ اور پھر سے اسی کے بارے میں سوچنے لگا۔

اپنا دھیان بٹانے کی خاطر سامنے ڈیجیٹل سائن بورڈ کی طرف دیکھا۔ ایک اشتہاری فلم چل رہی تھی جس میں ایک حسینہ چچماتی گاڑی سے اترتی ہے اور ایک ادا سے اپنے گلے سے اسکارف نکال کر ہوا میں لہرا دیتی ہے۔ کل اس لڑکی نے بلو جینز اور لال رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور اس کے گلے سے بھی ایک اسکارف جھول رہا تھا۔ اور پرسوں؟ پرسوں تو اس نے اسکرٹ اور بلاوز پہن رکھا تھا۔ نہیں یہ پہناوے تو لکھنؤ کے نہیں ہوسکتے۔

''توبہ، پھر سے وہی لڑکی۔'' میں نے دوسری طرف دیکھا۔

ساری میں ملبوس ایک جوان عورت ایک پیارے سے بچے کا ہاتھ پکڑے جارہی تھی۔ وہ لڑکی ساری بھی تو پہنتی

ہے۔ ایک دن تو وہ بنگالن لگ رہی تھی۔ مگر اس نے ماتھے پر بڑی سی بندی لگا رکھی تھی۔ بنگالی عورتیں اتنی بڑی بندی تو نہیں لگاتیں؟ یہ انداز تو تمل عورتوں کا ہے۔ آج کل پہناوے سے کسی کی پہچان متعین کرنا اتنا آسان بھی نہیں۔

مگر میں اس کی پہچان کے پیچھے کیوں پڑا ہوں؟ مجھے کیا وہ جہاں کی بھی ہو۔ میں نے ایک بار پھر سے اپنے ذہن کو جھٹکا۔ یہ دبئی ہے۔ یہاں بھانت بھانت کے لوگ رہتے ہیں۔ مجھے اپنی حد میں رہنا چاہیے۔ مجھے اپنے دل کو اس طرح بہکنے نہیں دینا چاہیے۔ کیا پتہ دل کہاں دھوکہ دے جائے۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ لڑکی میرے اعصاب پر سوار تھی۔ گھر کے قریب جس چوراہے سے میں اپنے دفتر کے لیے بس میں سوار ہوتا تھا پہلی بار وہ مجھے وہاں نظر آئی تھی۔ ہمارے بیچ تعارف کی کوئی صورت تو نہیں تھی مگر ہماری آنکھوں نے یہ کام کرلیا تھا۔ اس سے آگے کا مرحلہ میرے لیے ایک پہاڑ تھا جسے سر کرنے کا حوصلہ میں اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔

رفتہ رفتہ اس سے آنکھ مچونی کا سلسلہ بس اسٹاپ سے بڑھ کر بازار تک پہنچنے لگا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں بازار کسی ضرورت سے نکلا اور اس سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ مگر کبھی بھی مخاطب ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ یا تو میرے ساتھ کوئی ہوتا یا وہ کسی کے ساتھ ہوتی۔ ایک دن بازار میں وہ مجھے اکیلے نظر آئی۔ میں نے تہیہ کیا کہ اس سے بات کر کے رہوں گا، انجام چاہے کچھ بھی ہو۔ چونکہ ہماری آنکھیں ایک دوسرے سے متعارف تھیں اس لیے سامنے سے آتے ہوئے وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ میں اسے ''ہیلو'' کہنے کے لیے پوری طرح تیار تھا کہ اچانک میرا ایک ملاقاتی آدھمکا۔ ایک دوسرے موقع پر جب کہ گفتگو کا آغاز تقریباً ہو چکا تھا ایک خاتون آٹپکیں جو کہ اس کی جاننے والی تھی۔

ایک تیسرا موقعہ بھی بس اسٹاپ پر جاتا رہا۔ اپنی تمام تر ہمت جٹا کر اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ بیچ میں قریب ایک بلڈنگ کا واچ مین آگیا جس سے میری صاحب سلامت تھی۔ اتنی دیر میں وہ لڑکی بھی بس میں سوار ہو کر جا چکی تھی۔

''بمبئی کا رہنے والا ہے۔ میری بلڈنگ میں رہتا ہے، ایک پاکستانی فیملی کا پے انگ گیسٹ ہے'' کیرالہ کے رہنے والے اس شخص نے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندی میں اتنی اطلاع دی اور اس طرح خاموش ہوا کہ اب میں اس سے مزید کے لیے استفسار کروں۔ مگر میری حالت یہ کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ میری حرکت لوگوں کی نظروں میں ہے، میری محتاط طبیعت نے مجھے خبردار کیا۔

اس واقعہ کے بعد میری رہی سہی ہمت جواب دے گئی۔ میرا جذبہ بھی سرد پڑ گیا۔

کچھ دنوں بعد دبئی سے میرا تبادلہ ہوگیا۔ شہر چھوڑتے ہوئے اس کا ایک آخری دیدار ایئرپورٹ پر ہوا۔ ڈیوٹی فری شاپ کے سپر مارکیٹ میں داخل ہوا تو کیش کاؤنٹر پر وہ مجھے نظر آئی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ یہاں

کام کرتی ہے۔ اس اتفاق پر میں سرور کی ایک کیفیت سے گزرا۔ میرا بے اختیار جی چاہا کہ اس کے قریب جاؤں اور تکلف کی ساری دیواریں گرادوں۔ میں نے جلدی جلدی اپنی شاپنگ مکمل کی اور کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ ایک لمبی قطار تھی طویل انتظار کے بعد جب میں اس تک پہنچا تو حسب معمول میری ہمت پست ہو چکی تھی۔ رقم ادا کرنے اور سامان لینے کے سوا میں اس سے کچھ نہیں کہہ سکا۔ ہاں ہماری متعارف آنکھوں نے ضرور ایک دوسرے سے بات کی۔

کئی سال بیت گئے۔ دبئی کے ساتھ وہاں کی یادیں بھی پیچھے رہ گئیں۔ نئی راہوں اور نئی منزلوں نے ذہن پر نئے نقوش بنائے۔ پرانی باتیں بے معنی ہو گئیں۔ ایک سال سفر کے دوران دبئی ائیرپورٹ پر چند گھنٹے گزارنے پڑے۔ ڈیوٹی فری شاپ میں داخل ہوا تو بھولی ہوئی یادوں کے انبار سے ایک ٹیس اٹھی۔ میں نے سیدھے سپر مارکیٹ کا رخ کیا۔ دل نے سمجھایا کہ ضروری تو نہیں کہ وہ اب بھی وہاں ہو۔ ان جگہوں پر نوکری کو ویسے بھی دوام حاصل نہیں۔ آج ہے کل نہیں۔ ایک ہی جگہ پر وہ سالوں سے ہوگی ضروری تو نہیں۔ مگر اگلے لمحے اسی دل نے کہا دیکھ لینے میں حرج بھی نہیں۔ تیز تیز چلتا ہوا سپر مارکیٹ پہنچا اور پہلی فرصت میں کیش کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی کو دیکھا۔ ایک خوب صورت مگر انجان چہرہ نظر آیا۔ دل ہی دل میں اپنے آپ پر ہنسا۔ ''دیکھا میں نہ کہتا تھا۔'' مکمل تسلی کے لیے وہاں موجود تمام سیلز گرلز کو ایک ایک کر کے دیکھ ڈالا اور ہر بار اپنے آپ پر ہنسا۔ ان میں کوئی بھی چہرہ مانوس نہیں تھا۔

چونکہ سپر مارکیٹ میں داخل ہو چکا تھا اس لیے یونہی دو چار چیزیں اٹھا کر ٹرالی میں رکھ لیں.. اس دوران اپنا ایک ذیابطیس زدہ دوست یاد آیا۔ اس کے لیے کچھ شوگر فری ٹافیاں اُٹھائیں اور کاؤنٹر پر پہنچا۔ اتفاق سے ان ٹافیوں پر قیمت واضح نہیں تھی۔ ذرا توقف کے بعد کاؤنٹر کلرک نے پاس سے گزرتی ہوئی اپنی ایک سینئر ساتھی کو روک کر وہ ٹافیاں دکھائیں۔ پختہ عمر کی وہ عورت ٹافیوں کو ہاتھ میں لے کر کچھ پڑھنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر آگے بڑھ کر مشین میں ایک انٹری کی۔ اس عورت کے چہرے پر میری نظریں پڑیں تو ایک مانوس سی شکل میری آنکھوں میں اُبھر آئی۔ مشین سے ہٹتے ہوئے ایک اچٹتی سی نگاہ اس عورت نے بھی میرے اوپر ڈالی اور ٹھٹھک کر دوبارہ دیکھا۔ چونکہ ہماری آنکھیں متعارف تھیں اس لیے ان کے بیچ پل بھر کو مکالمہ بھی ہوا۔ مگر وہ عورت کوئی بات کیے بغیر آگے بڑھ گئی۔

میں نے بھی اپنی راہ لی۔

Address:
Daily "Arab New"
Post Box # Jeddah : 21432
(K.S.A.)

مسئلہ

طاہر نقوی

ائیر پورٹ پر میری بیوی کو دیکھ کر شیراز حیران رہ گیا۔ وہ یونیورسٹی کے زمانے سے میری اور فریدہ کی دوستی سے واقف تھا۔ مگر اسے ہماری شادی کا علم نہیں تھا۔

شادی ہوتے ہی ابوظہبی کی ایک فرم کی طرف سے مجھے مناسب ملازمت کی آفر ملی تو میں نے قبول کر لی۔ شیراز کو ابوظہبی فون کر کے اس خوش خبری کی اطلاع دی۔ وہ بہت خوش ہوا اور اپنے گھر ٹھہرنے کی ضد کرنے لگا۔ میرے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ ائیر پورٹ سے نکل کر شیراز کی گاڑی میں بیٹھے۔ میں اور فریدہ گزرتے ہوئے علاقوں کو دیکھتے رہے۔ دونوں طرف سبزہ، صاف ستھری کشادہ سڑکیں اور خوب صورت عمارتیں دیکھ کر میں اور فریدہ مطمئن ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ میں نے اس دوران شیراز سے پوچھا۔

"یار۔ میرے لیے کوئی مکان......"

وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہنے لگا کہ "فکر کیوں کرتے ہو۔ جب تک تمہیں کوئی اپارٹمنٹ نہیں ملتا آرام سے ہمارے ساتھ رہو۔" میں چپ رہا اور فریدہ کو اطمینان دلانے والی نظروں سے دیکھا۔ شیراز نے اپنے خوب صورت اپارٹمنٹ کے سامنے گاڑی روک دی۔ میں نے اتر کر عمارت اور آس پاس کے علاقے پر نظریں ڈالیں۔ میں اور شیراز گاڑی سے سامان اتار کر عمارت میں داخل ہوئے۔ فریدہ سب کچھ متجسس انداز میں دیکھ رہی تھی۔ آٹھویں منزل پر لفٹ رکتے ہی شیراز نے سامان اتارا میں نے اس کی مدد کی۔ اس نے اپنے فلیٹ کی اطلاعی گھنٹی بجائی۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا تو اس کی بیوی روبینہ اور فریدہ نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا اور خوشی کے عالم میں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ میں اور شیراز حیرانی سے دیکھتے رہے۔ پتہ چلا کہ وہ دونوں پڑوس میں رہا کرتی تھیں۔ البتہ میں اور شیراز اس حسن اتفاق پر ہنستے رہے۔ فلیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ یہ فلیٹ محض ایک کشادہ بیڈ روم، کچن اور باتھ روم پر مشتمل تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے شیراز کے سامنے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ لیکن اس نے تسلی دی۔ ہمارا بیڈ ایک کونے میں اور ان کا بیڈ کمرے کے دوسرے کونے میں کر دیا گیا۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر ہم چاروں دیر تک گپ شپ کرتے رہے۔

اگلی صبح میں شیراز کے ساتھ اپنی ڈیوٹی جوائن کرنے کی غرض سے گیا۔ میرا آفس اس کے آفس کی بلڈنگ کے سامنے ہی تھا۔ ایسے اتفاقات نہ ہوں تو زندگی بے کیف ہو کر رہ جائے۔ چنانچہ میں اسی کے ساتھ آفس آنے جانے لگا۔ آفس کے بعد میں اور شیراز اپارٹمنٹ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ اسٹیٹ ایجنسیوں کے چکر

لگاتے۔ اخبار کے اشتہارات دیکھتے۔ شیراز نے اپنے جان پہچان والوں سے بھی کہہ دیا۔ ہم دونوں تھکے ہارے گھر میں داخل ہوتے تو فریدہ اور روبینہ مل جل کر کام کاج میں مصروف نظر آتیں۔ میرے داخل ہوتے ہی فریدہ مجھے سوالیہ نظروں سے کھنگالتی۔ میں ہر بار مایوسی سے سر ہلا دیتا۔ یوں دس پندرہ روز بیت گئے۔ مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ میرے وہم وگمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ ابوظہبی میں رہائش کا مسئلہ اتنا سنگین ہوگا۔ اب روبینہ، شیراز سے اُلجھنے لگی تھی۔ شیراز اسے اشاروں اشاروں میں سمجھاتا۔ فریدہ یہ سب دیکھ کر میری طرف دیکھتی رہتی۔ میں خاموش رہتا۔ شیراز خود بھی اب چپ چاپ رہنے لگا تھا۔ لیکن مجھ سے کچھ نہ کہتا۔ ایک روز میں اور فریدہ ایک شاپنگ مال دیکھنے کے لیے تیار ہوئے۔ میں نے شیراز اور روبینہ سے ساتھ چلنے کو کہا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ میں نے خود بھی اصرار نہیں کیا۔

اپارٹمنٹ سے اتر کر ہم دونوں فٹ پاتھ پر چپ چاپ گزرتے رہے۔ میرے ذہن میں اب بھی رہائش کا مسئلہ رینگ رہا تھا۔

''ایسے کب تک چلے گا'' اچانک فریدہ نے پوچھا۔

''میں کیا کروں'' میں الجھنے لگا۔

''کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دیتا بھی تو کیا جواب دیتا۔

''آخر کیوں نہیں مل رہا کوئی اپارٹمنٹ؟''

''میری استطاعت کے مطابق نہیں مل رہا''

''پھر؟''

''جو ملتا ہے۔ اس کے لیے میری جیب اجازت نہیں دیتی۔''

''اب تو وہ دونوں آپس میں اُلجھنے لگے ہیں۔''

''ہاں۔ مجھے احساس ہے۔''

فریدہ شاپنگ مال میں سارا وقت عدم دلچسپی سے گھومتی رہی۔ میرا جی بھی نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے تھوڑی دیر میں ہم دونوں وہاں سے باہر نکل آئے۔ میری بے چینی اور بے قراری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مگر فریدہ سے کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ خود وہ بھی کشمکش میں لگتی تھی۔ چلتے چلتے میں کچھ کہتے ہوئے رک گیا۔ اس نے مجھے محض سوالیہ انداز میں دیکھا۔

''سچ کہہ رہی ہو۔ یوں کب تک......'' میں نے اپنی معنی خیز بات کو ادھورا چھوڑ دیا۔

''کیا مطلب؟''

''تم میرا مطلب سمجھ چکی ہو''
اس نے شرما کر اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا اور شوخی سے پوچھا۔
''تو میں کیا کروں؟''
''ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے۔''
اس نے تجسس کے عالم میں مجھے دیکھا۔ میں نے اسے ساری بات بتائی۔ اس نے پریشان ہو کر کہا۔
''بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔''
تب میں نے اسے سمجھایا تو وہ مان گئی۔
اس رات تھکن کا بہانہ بنا کر ہم جلد لوٹ آئے۔ اور محض سوتے ہوئے بن گئے۔ کوئی ایک بجے کے وقت میں فریدہ کو ہوشیار کر کے اپنے بیڈ سے اٹھا اور دبے قدموں باتھ روم کی طرف بڑھا۔ آہستگی سے دروازہ کھول کر جیسے ہی میں اندر داخل ہوا تو ٹھٹھک کر رہ گیا۔
وہاں روبینہ پہلے سے موجود تھی!

❁❁

Address:
G.P.O. Box # 111090,
Gulshan-e-Iqbal,
Karachi : 75850

ایک تاڑو مسافر کا رپورتاژ

اقبال فریدی

یہ میاں علی بابر کی ملک سے باہر پہلی پوسٹنگ تھی۔ کام ایسا تھا جو کمپیوٹر کے ساتھ ساتھ انسانی ہاتھوں کی خلاقانہ ترمیم و اضافے کا متقاضی رہتا تھا۔ کمپیوٹر کا کیا تھا وہ تو دی گئی کمانڈ کے مطابق خاکے کا پرفیکٹ پرنٹ آؤٹ دے دیتا۔ یہ پرنٹ آؤٹ مشینی ہوتا تھا انتہائی حد تک درست مگر انسانی ہاتھوں سے بنائی ہوئی خلاقانہ لکیروں سے محروم۔ میاں علی بابر کی پنسل کمپیوٹر کے بتائے ہوئے خاکے میں انسانی جذبوں کی آمیزش کر دیتی۔ چند لکیروں پر مشتمل یہ انسان آمیزش یا انسان آمیزی مکمل ترین کمپیوٹر ڈیزائن کو زندہ جدید اور پسند کیا جانے والا ڈیزائن بنا دیتی تھی۔ اسی لیے اس شعبے میں ان کی مانگ بہت تھی اور پھر وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت زیادہ معقول ماہانہ مشاہدے کے ساتھ اس سرد ترین ملک میں آ گئے تھے۔ یہاں ایک ۴۰ منزلہ عمارت میں ۳۵ ویں فلور پر ان کا دفتر اور رہائش تھی اس فلور پر دفتر کے کمروں سے ملحق ہی کوئی ڈیڑھ کمرے پر مشتمل ایک اپارٹمنٹ انہیں رہنے کے لیے دے دیا گیا تھا۔ یہاں گیس جلانے کا رواج نہیں تھا اس لیے کوکنگ کے لیے بھی بجلی استعمال ہوتی تھی اس کچن میں کچن کیبنٹ کے ساتھ ایک تپائی نما گول میز جو خاص اونچی تھی ساتھ ہی ایک اونچا آرام دہ اسٹول رکھا ہوا تھا گویا یہ اپارٹمنٹ صرف ایک فرد کے لیے بنایا گیا تھا۔

اس عمارت کا تیسواں فلور ان کا پورا آفس تھا اسی فلور پر آفس کے کمروں کے مقابل ایسے ہی ڈیڑھ کمروں کے اکا دکا اپارٹمنٹ بھی تھے جو انہیں کی طرح بیار اور غیر ملکیوں کو دیے جاتے تھے۔ نئے آنے والے کو کوئی دشواری نہ ہوتی اس لیے کہ یہ تمام مختصر اپارٹمنٹس نہ صرف فرنشد ہوتے تھے بلکہ کچن میں ایک آدمی کی ضرورت کے مطابق کٹلری اور کراکری بھی موجود ہوتی تھی۔ صبح جب وہ تیار ہو کر اسی فلور پر بنے اپنے آفس میں چلے جاتے تو ایک ماڈرن ماسی نما مخلوق جو اسی دفتر کی ملازم تھی وہ اپارٹمنٹ میں آتی اور کمرے اور کچن کی عمومی دیکھ بھال کر کے دوسرے اپارٹمنٹ میں چلی جاتی۔ اس فلور پر موجود تمام رہائشی اپارٹمنٹس کی چابیاں اس کے پاس ہوتیں۔ اس لیے کہ اس معاشرے میں چوری کا کوئی رواج نہیں تھا۔

اور نہ کسی پر چوری کا شبہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ ماڈرن ماسی مسز ہوشو کہلاتی تھی اور احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھی سوائے ہائی سیکرٹ کاغذات کی الماری کے پورے آفس کی چابی بھی مسز ہوشو کے پاس رہتی تھی۔ اور گذشتہ دس سال سے وہ اسی کام پر معمور تھی اور ہر طرح اعتبار حاصل کر چکی تھی۔ مسز ہوشو کی مقبولیت اور تکریم اتنی تھی کہ اگر کسی ضرورت کے تحت وہ دفتر کے چیف باس کے کمرے میں چلی جاتی تو چیف باس بھی اپنی کرسی سے اونچے ہو کر "ہیلو

مسز ہوشو'' ہاؤ آر یو'' کا نعرہ ضرور لگاتے جواباً مسز ہوشو کی مسکراہٹ بہت سنجیدہ مگر دلکش ہوتی۔

میاں علی بابر کے اس اپارٹمنٹ کے علاوہ دفتر کے چند بڑے ہال نما کمرے چھوڑ کر ڈیڑھ کمرے کا ایک اور اپارٹمنٹ تھا۔ جو بھارت کے جنوب سے آئے ہوئے ایک اور ملازم کرشن کمار بھگت کے پاس تھا۔ کرشن کمار بھگت کرشن بھگتی تحریک کا نہ صرف ممبر تھا بلکہ اپنی پوجا کے آداب کے مطابق صبحوں اور راتوں کو ریاضت بھی کیا کرتا تھا۔ اس کے رہن سہن اور صبح وشام پوجا کی پابندی اور کسی طور بھی ماس نہ کھانے کے سبب لوگ کرشن کمار بھگت کو پہنچا ہوا ماڈرن سنیاسی اور فوق الفطرت قوتوں کا حامل انسان سمجھتے تھے۔ یہ اپنے دفتر اور دفتر کے باہری حلقوں میں بھی کے کے بھی (KKB) کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس کی شہرت میں چار چاند جب لگے جب ایک مرتبہ ایک بڑی لاٹری کا ٹکٹ خریدنے سے پہلے مسز ہوشو نے کے کے بی سے مشورہ کیا کہ وہ کس طرح ٹکٹ خریدے کہ اس کے نام پر ایک بڑی لاٹری نکل آئے۔ کے کے بی نے اس کے نام اس کے ماں باپ کے نام اور جس شہر میں وہ پیدا ہوئی تھی اس کے لانگی چیوڈ اور لیٹی چیوڈ کو اعداد میں تبدیل کیا پھر جمع تفریق اور برجوں کا شمار کرنے کے بعد کے کے بی نے مسز ہوشو کو بتایا کہ وہ ایسے لاٹری ٹکٹ کو خریدیں جس کے نمبر کے تمام اعداد کا مجموعہ یعنی فرد عدد آٹھ بنتا ہو۔ تم یقیناً ایک بڑا انعام حاصل کرلوگی کے کے بی کے جمع تفریق برجوں اور اوقات کا حساب کتاب ہندی یا سنسکرت زیادہ اور ہندسی اشکال میں کر رہا تھا اس لیے مسز ہوشو اس کی جادوئی مہارت کی معتقد ہوئی جارہی تھی اس یقین کے ساتھ اسی شام اس نے ۲۰ ڈالر والی لاٹری کا ایک ایسا ٹکٹ ۲۵ ڈالر میں خریدا جس کے نمبروں کا مجموعی عدد آٹھ نکل رہا تھا۔ اور جس کی قرعہ اندازی دوسری صبح ہونے والی تھی۔ ظاہر ہے یہ ٹکٹ کاؤنٹر سے نہیں خریدا جاسکتا تھا اس لیے کہ وہاں بلیک مارکیٹنگ کا رواج نہیں تھا اور لاٹری ٹکٹ کی قانونی فروخت بند ہوچکی تھی۔ مسز ہوشو نے یہ ٹکٹ ایک ایسی اوباش لڑکی سے لیا تھا جس کے پاس ۲۰ ڈالر کا یہ ٹکٹ تو موجود تھا لیکن جسے فوری طور پر ۲۵ ڈالر کی شدید ضرورت تھی۔ مکمل یقین اور بے پناہ خوشی کے ساتھ ٹکٹ لے کر مسز ہوشو کے کے بی کے اپارٹمنٹ پہنچ گئی۔ ہلکی سی دستک دے کر اپنی ہی چابی سے دروازہ کھول کر وہ اپارٹمنٹ میں داخل ہوگئی۔

سامنے ہی کے کے بی ماتھے پر سندور سے بڑا سا ٹیکہ آنکھوں میں گہرا دنبالہ دار کاجل لگائے مختصر سی سفید دھوتی لنگوٹ کے انداز میں کس کر ایسے آسن میں بیٹھا ہوا تھا جو شاید اس کی ضیافت کا حصہ تھا۔ مسز ہوشو نے بڑی عقیدت سے اپنے سینے پر صلیب بنائی اور ہاتھ جوڑ کر گھٹنے کے بل ان کے سامنے بیٹھ گئی کے کے بی نے بھی سر ہلا کر اسے ہیلو کہا اور پھر اپنے بھگتی آسن سے رفتہ رفتہ ایک ایک عضو کے ساتھ نارمل پوزیشن میں آتے آتے لگ بھگ ایک ڈیڑھ منٹ لگ گئے پھر کے کے بی نے بھی مسز ہوشو کی طرح دونوں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر نمستے کے انداز میں ہاتھ جوڑ دیے۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد کے کے بی نے مسز ہوشو کو صوفے پر بیٹھنے کی دعوت دی اور خود بھی ہاؤس کوٹ پہن کر اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئے مسز ہوشو نے انتہائی جذباتی انداز میں اپنے پرس سے

لاٹری ٹکٹ نکال کر کے کے بی کے سامنے کھول دیا۔ کے کے بی نے ایک لمحے کے لیے سنجیدگی سے ٹکٹ کو دیکھا پھر ان کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ لکی، تم بہت لکی ہو۔ اس نمبر پر ایک بڑا انعام ضرور نکلے گا۔ ٹکٹ کو ایک مرتبہ پھر دیکھو آخری عدد کو چھوڑ کر سارے نمبر جوڑے بنا رہے ہیں اور ہر جوڑے کا مجموعی عدد آٹھ ہے۔ اور اس آخری نمبر سمیت تمام اعداد کا مجموعی عدد بھی آٹھ ہے۔ تم ڈبل لکی ہو لاٹری کب کھل رہی ہے؟'' کل صبح گیارہ بجے'' مسز ہوشو نے خوشی خوشی جواب دیا۔ کے کے بی نے حیرت سے پوچھا مگر کیسے لاٹری ٹکٹ کی سیل تو پہلے ہی بند ہوگئی تھی تم نے آج کیسے خرید لیا جواباً مسز ہوشو نے ۵ ڈالر زیادہ دے کر اس اوباش لڑکی سے ٹکٹ خریدنے کی کہانی سنا دی۔ کے کے بی نے دوستانہ بے تکلفی سے مسز ہوشو کا کندھا تھپتھپایا '' تم یقیناً بہت لکی ہو'' مارے خوشی کے مسز ہوشو نے اجازت لیے بغیر چھوٹے کچن میں جا کر دو کپ اسٹرانگ اٹیلین اسٹائل کی کافی بنائی اور ایک کپ سے چسکی لیتی ہوئی دوسرا کپ کے کے بی کے سامنے رکھ دیا۔ '' واقعی اگر میرا کوئی بڑا انعام نکل آیا تو پورے آفس کو ہائی ٹی ٹریٹ دوں گی اور تمہارے لیے اسپیشل گفٹ اس کے بعد وہ تقریباً اڑتی ہوئی اڑتا ہوا ہوائی بوسہ اُچھالتے ہوئے بھنورے کی طرح اپارٹمنٹ سے باہر نکل گئی۔

آفس میں دوسری صبح ۱۰ بجے کے چائے کے وقفے کے بعد آفس کا پرسکون ڈسپلن بہت زیادہ ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ مسز ہوشو انتہائی یقین کے ساتھ کے کے بی کی ریاضت اور غیب دانی کا چرچا کر رہی تھیں کہ ثبوت چاہیے تو آج دیکھ لینا میرا لاٹری ٹکٹ ضرور نکلے گا۔ اس طرح شاید وہ اپنے دل کو بھی یقین دلا رہی تھیں۔ لاٹری ٹکٹ کے بارے میں گہما گہمی دیکھ کر آج چیف باس بھی کیفے ٹیریا میں آ گئے تھے۔ اتفاق یہ تھا کہ چائے کا وقفہ بھی ٹھیک گیارہ بجے ختم ہوتا تھا۔ اور ٹھیک گیارہ بجے ہی ٹی وی پر اسی لاٹری کی قرعہ اندازی کی تقریب تھی۔ چیف باس نے اپنے لوگوں کی دلچسپی اور گہما گہمی دیکھ کر خصوصی طور پر آج کے لیے چائے کے وقفے میں ساڑھے گیارہ بجے تک اضافہ کر دیا تھا۔ گیارہ بجتے ہی مسز ہوشو کی بے چینی اور کے کے بی کے چہرے کا اطمینان دیکھنے والا تھا۔ گیارہ بج کر دو تین منٹ ہی ہوئے تھے کہ آفس کا ہال نما کامن روم جس میں ٹی وی اور چھوٹے موٹے ان ڈور گیمز کی سہولت موجود تھی یکلخت خوشی کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ مسز ہوشو لاٹری ٹکٹ ہاتھ میں لیے خوشی بھرے آنسوؤں کے ساتھ سب سے باری باری مصافحہ کر رہی تھیں۔ مصافحہ کرنے والے کے کے بی سے ان کی غیب دانی کے سبب نہایت عقیدت کے ساتھ مل رہے تھے۔ کے کے بی بھگت ہونے کے سبب شراب اور عورتوں سے دور رہتے تھے اس لیے اس خوشی کے موقع پر شیمپین کا جھاگ کا فوارہ نہیں اُڑایا گیا۔ مسز ہوشو کے ہوش اڑے ہوئے تھے صرف ۲۵ ڈالر خرچ کر کے ہنڈرڈ تھاؤزینڈ ڈالرز کا کیش انعام کا حقیقی خواب مسز ہوشو کے لیے ہنڈرڈ تھاؤزینڈ ڈالرز کسی خواب اور جیتا ہوا لاٹری کا ٹکٹ ان کے ہاتھ میں تھا دیگر تمام لوگ کے کے بی کے اطراف نیم دائرہ بنائے بیٹھے تھے ادھر ایک اور ورکر جس کے پاس اسی لاٹری کا ٹکٹ تھا لیکن جس کا انعام نہیں نکلا تھا۔ وہ مایوسی کے ساتھ انٹرنیٹ پر جیتنے والے ٹکٹوں کے

اعداد سے کھیل رہا تھا۔اس نے زوردار آواز میں ایک نیا انکشاف کیا کہ اس لاٹری میں جس جس ٹکٹ پر انعام نکلا ہے۔ الگ الگ سب کے نمبروں کا مجموعی عدد آٹھ بن رہا ہے کے کے بی کی اس غیب دانی پر سب عش عش کر اُٹھے۔ چائے کا وقفہ ختم ہونے کو تھا کہ مسز ہوشو نے سیلف سروس کیفے ٹیریا میں ہر ایک کو چائے لاکر پیش کی اور مبارک باد وصول کرتی رہیں۔ کچھ ہی دیر کے بعد آفس کے تمام افراد پوری ڈسپلن کے ساتھ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

میاں علی بابر جن کے تذکرے سے ۳۵ ویں فلور پر قائم آفس اور بیچلرز اپارٹمنٹ کا تذکرہ شروع ہوا تھا۔اس معاشرے میں رہ کر بھی پرہیز گار متقی اور عملی مسلمان تھا وہ بھی اس تمام گہما گہمی میں شامل تھا لیکن کے کے بی کے عیقدت مندوں میں نہیں۔ سب نے اس بات کو محسوس کیا لیکن کسی نے ان سے پوچھا نہیں کہ وہ کے کے بی سے اتنا غیر متعلق کیوں بن رہے ہیں۔ شاید سب کو یہی گمان ہوا کہ ایشین ہونے کے سبب وہ کے کے بی کی مقبولیت اور فوق الفطرت قوتوں سے حسد کر رہا ہے مگر میاں علی بابر کا عالم ہی دوسرا تھا۔اوّلین گہما گہمی سے لے کر اس وقت تک اس کے دل میں اور اس کی زبان پر صرف جنت کی کنجی کی گردان تھی وہی لاحول ولا قوۃ .... مگر انسانی جبلت ہر حال میں ایک غالب حقیقت تھی اور میاں علی بابر بہر حال ایک زندہ نوجوان تھے۔ زندہ اور باعمل دین کے ایک ایسے مسلک کے پیرو جہاں کراماتیں اور متصوفانہ فوق الفطرت کراماتیں، علم الاعداد ستارہ شناسی وغیرہ کسی حقیقت کے حامل نہیں تھے وہ اس طرح کی باتوں کو کرشمہ بازیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اسی لیے وہ کے کے بی اور مسز ہوشو کی تمام گہما گہمیوں میں شامل تھے لیکن غیر موجود تھے اور غیر مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ اپنی آنکھیں جھکائے گویا کھوئے ہوئے تھے لوگ بظاہر حسد کا کیس تصور کر رہے تھے اور خود کے کے بی بھی اسے میاں علی بابر کے حاسدانہ روّیے پر محمول کر رہا تھا۔

مگر علی بابر کا حال ہی دگرگوں تھا۔ وہ ایک شیر پر سوار ایک گھنے جنگل میں بغیر پگڈنڈی کے رستوں پر چلتے ہوئے اس بزرگ کے پاس جلدی سے جلدی پہنچنا چاہ رہے تھے جو اس جنگل کے لگ بھگ وسط میں ایک گھنے شاخسار کو اپنی کٹیا بنا کر رہتے تھے ایک مرتبہ علی بابر اپنے دوستوں کے ساتھ جنگل میں چھوٹے موٹے شکار کے لیے اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا کہ ایک گھنے شاخسار میں بنے ہوئے ایک کھڑکی نما سرنگ سے یہی بزرگ کسی پھرتیلے چوپائے کی طرح باہر نکلے علی بابر کے تمام دوست ان سے واقف تھے یہ بہت جلالی بزرگ مشہور تھے اور جس کو دیکھ کر جو کہہ دیتے وہ پورا ہو جاتا۔اس لیے علی بابر کے تمام دوست بابا کے سامنے سے تتر بتر ہو گئے۔ علی بابر بابا کی نظروں کی زد میں آ گیا اور انہیں بے اختیار ادب کے ساتھ سلام کر بیٹھا۔ بابا نے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ شفقت سے اندر آنے کا اشارہ کیا اور پھر اسی طرح پھرتیلے چوپائے کی طرح ساخسار کے داخلی سرنگ نما راستے میں گھستے چلے گئے۔علی بابر کے دل میں کوئی خوف نہیں تھا وہ بھی انہیں کی طرح ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل ان کے پیچھے چلتے ہوئے

اس گھنے شاخسار کے خلا میں داخل ہو گیا۔ شاید اس راستے سے بابا کے چوپائے کی طرح آنے جانے کے سبب یہ سبز گھنی راہداری اتنی ہموار ہو گئی تھی کہ کوئی کنکر یا کوئی کانٹا ان کے ہاتھوں اور گھٹنوں میں نہیں چبھا۔ یہ سبز سرنگ شاخسار کے مرکزی تنے کے قریب ختم ہوتی تھی۔ تنے کے چاروں طرف ایک گول کوٹھری نما جگہ تھی اس مرکزی درخت کے تنے کے چاروں طرف اس گول جگہ کی چھت سبز گھنی شاخوں سے اس طرح ڈھکی ہوئی تھی کہ دھوپ نیچے نہیں آتی تھی۔ فرش پر نرم سوکھی ہوئی گھاس کی ایک موٹی تہہ بچھی ہوئی تھی ایک طرف پانی کا ایک گھڑا رکھا تھا۔ اس شاخسار کٹیا میں ایک سیلن زدہ نمی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک طرف گھاس کی تہہ دبیز ہو کر اس طرح ہو گئی تھی گویا مصلے کے طور پر استعمال کی جاتی ہو اس کا رخ بھی قبلے کی طرف تھا۔ بابا نے المونیم کے گلاس کو ہی گھڑے میں ڈبو کر اس طرح پانی نکالا کہ ان کی انگلیوں کی پوریں پانی میں ڈوبنے نہ پائیں۔ انہوں نے پانی کا یہ گلاس علی بابر کی طرف بڑھایا۔ وہ بلا کراہت آہستہ آہستہ کر کے پورا گلاس پی گیا۔ پانی میں ہلکی ہلکی کوئی کی بو سی ہوئی تھی جو اس وقت علی بابر کو کیوڑے سے زیادہ فرحت بخش اور خوشبودار محسوس ہوئی اس کے بعد اس کٹیا میں نور برساتی ہوئی دھند اور کہر کے بادل گھنے ہو گئے۔ پھر علی بابر کے ذہن میں دھندلی دھندلی نور آلود شبنم سے دھلی ہوئی کچھ یادیں رہ گئی تھیں۔ تصوف کے اسرار و رموز بغیر علمی اصطلاحوں کے اس کے اندر رچ بس گئے تھے بابا نے کیا کچھ کہا تھا اسے یاد نہیں تھا مگر سب کچھ اندر رچ بس گیا تھا۔ آئندہ اختیار کیے جانے والے تقویٰ اور طہارت کا نور اور مضبوط ارادہ لیے ہوئے چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتا ہوا اس شاخسار کی سبز سرنگ سے بابا ہی کی طرح پھرتیلے چوپائے کی طرح شاخسار کی سبز محرابی سرنگ سے باہر آیا تو اس کا چہرہ مطمئن اور بشاش تھا۔ اسے اس طرح دیکھ کر اس کے ساتھیوں کی جان میں جان آئی۔ علی بابر کو محسوس بھی نہیں ہوا کہ اسے کتنا وقت اطمینان اور سکون کے ساتھ اس شاخسار کٹیا میں گذارا۔ وہی اطمینان جو اللہ کے ذکر سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے شکار کے ساتھیوں نے یہ ایک گھنٹہ اس کش مکش میں گذارا کہ یہیں رہ کر علی بابر کا انتظار کیا جائے یا اس کے والدین کو جا کر یہ اطلاع دی جائے کہ علی بابر کو جلالی بابا اپنے ساتھ شاخسار کٹیا میں لے گئے تھے اور قریب قریب ایک گھنٹہ ہو رہا ہے کہ وہ باہر نہیں آیا۔ یہ سبز شاخسار اتنی گھنی تھی کہ اندر کی گول کٹیا کا منظر یا کوئی جھلک بھی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ بہت دیر سے اندر رہی ہے۔

اس علاقے کے لوگ جلالی بابا سے اچھی طرح واقف تھے اور کسی حد تک خوفزدہ بھی تھے کہ ایک مرتبہ چند اوباش لڑکوں کا گروپ انہیں نیم مجذوب یا پاگل سمجھ کر چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا کہ سب سے زیادہ شریر اور بدتمیز نوجوان سے ان کی نظریں چار ہو گئیں تو جلالی بابا نے جھنجھلا کر اس سے اشارتاً کہا ''جا مر جا'' سارے شریر لڑکے بابا کی بات پر دھیان دیے بغیر اسی اوباشی کے انداز میں ہنستے کھیلتے بابا کو چھیڑتے اپنی اپنی گلیوں اور گھروں میں اِدھر اُدھر جانے لگے مگر وہ لڑکا جسے بابا نے جا مر جا کہہ کر جھڑکا تھا۔ اس نے جب اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا اسے خون کی الٹی ہو گئی اور اس سے پہلے کہ وہ گلیارے میں قدم رکھتا وہ الٹی کر کے سنبھلا ڈگمگایا اور بے جان ہو کر گلیارے کے

اندر ڈھے گیا۔ ہر طرف ہاہا کار مچ گئی۔ حکیم صاحب دوڑے ہوئے آئے نبض دیکھی جو بند ہو چکی تھی۔ مردہ پلکیں اٹھا کر آنکھیں دیکھیں سینے اور پیٹ کو ٹٹول کر دیکھا اور پھر انکشاف لگیا کہ کسی شدید خوف اور دہشت کے سبب اس کا جگر پھٹ گیا۔ مرحوم کے دوستوں کی زبانی جامرجا کی کہانی عام ہوگئی گاؤں کے تمام لوگ اس کی لاش لے کر بابا کی شاخسار کٹیا کے سبز سرنگ نما راستے کے سامنے دھرنا دیے بیٹھ گئے۔ مرحوم کے متعلق عورتیں اور بچے اس کی جواں مرگی پر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ اپنی سبز شاخسار کے باہر غیر معمولی شور محسوس کر کے بابا اسی طرح چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتے ہوئے سبز سرنگ سے باہر آئے۔ انہیں باہر آتے دیکھ کر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ بین کرتی ہوئی عورتیں بھی چپ ہو گئیں۔ بابا نے ایک نظر میں سارا معاملہ بھانپ لیا اور کسی سے آنکھیں چار کیے بغیر اور بغیر کسی کو مخاطب کیے اونچی آواز میں بولے "لے جاؤ۔ اللہ کی مرضی یہی تھی مردہ تیار ہو تو دفن کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے لے جاؤ" ان کی آواز میں استادبد بہ تھا کہ کسی کو ان سے حجت کرنے یا لاتی ہوئی ماں کو اپنے مردہ بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگنے کی ہمت بھی نہ ہوئی اور مجمع چارپائی پر سفید چادر سے ڈھکی ہوئی لاش لے کر واپس روانہ ہو گیا۔ اس وقت تک علی بابر شیر پر سوار بابا کی سبز شاخسار کی محرابی سرنگ سے ہوتے ہوئے بابا کے قریب پہنچ گئے۔ اتنی دور سے آنے پر سانس تو شیر کا پھولنا چاہیے تھا لیکن علی بابر کا سانس یوں پھول رہا تھا گویا وہ خود اتنی دور سے اپنے قدموں پر دوڑتے ہوئے آئے ہیں۔ بابا نے اپنی انگلیاں ڈبائے بغیر المونیم کے گلاس میں نکالا اور سلام کا جواب دیتے ہوئے پانی علی بابر کو دیا۔ وہی کائی بھری کیوڑے کی فرحت بخش خوشبو طبیعت ایک دم اعتدال پر آ گئی کیا تم مجھ سے کوئی چمتکار حاصل کرنے آئے ہو؟ یہ دیکھو۔ یہ کہہ کر بابا نے اپنی انگلیوں کو یوں جھٹکا جیسے انگلیوں سے پانی چھڑکتے ہیں۔ اس سبز شاخسار کٹیا میں۔ انگلیوں کے جھٹکتے ہی ہر طرف دھنک رنگ قوس اور کمانیں تیزی سے گردش کر کے غائب ہو گئیں۔

"نہیں نہیں نہیں۔ خدا کی قسم نہیں میں کوئی چمتکار حاصل کرنے نہیں آیا ہوں دراصل ان سب جادوئی شماریات میں گھرے لوگوں کے درمیان میں تنہا رہ گیا تھا۔ اس لیے اطمینان قلب کی خاطر میں آپ کے دیے ہوئے شیر پر بیٹھ کر آپ کے پاس آ گیا۔" بابا نے اس مرتبہ اپنی انگلیوں کی پوریں گھڑے کے پانی میں ڈبو کر نکالیں اور اس کے چہرے اور سینے پر انگلیوں سے پانی چھڑک دیا۔ انہوں نے اس اطمینان بھری ٹھنڈک کو محسوس کیا۔ شیر نے انہیں اپنی پیٹھ سے سرکایا اور انہیں کرسی پر بٹھا کر ان کی رانوں کے نیچے سے نکل گیا بالکل ایسے ہی جیسے بابا کی شاخسار کٹیا میں رقص کرتی ہوئی دھنک رنگ قوسیں اور کمانیں غائب ہو گئی تھیں اور معلوم بھی نہیں ہوا تھا اس دوران چائے کا وقفہ ختم ہوئے اتنی دیر ہو گئی کہ لنچ بریک شروع ہو گیا۔ آج کا لنچ مسز ہوشو کی طرف سے سب کے لیے بطور دعوت اریخ کیا گیا تھا۔ ٹی بریک کارکردگی کے اوقات سے لنچ بریک تک علی بابر بہت سی نظروں میں رہے۔ بہت سے لوگوں نے ان کا سینہ پھولتے پچکتے یوں دیکھا جیسے وہ میلوں سے دوڑتے چلے آ رہے ہوں پھر انہوں نے ہی یہ

بھی دیکھا کہ یکلخت وہ یوں پُر سکون ہو گئے جیسے ڈاکٹر نے انہیں کسی بہت اچھے ٹرانکوئی لرز کا ہیوی ڈوز انجکشن لگا دیا ہو۔ کے کے بی چہرے سے زیادہ اطمینان اور مسز ہوشو کے چہرے سے زیادہ احساس مسرت ان کے چہرے پر نمایاں تھا۔ دو چار نظریں جوان پر لگی تھیں انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ احساس مسرت اور اطمینان کے باوجود پسینے کے قطرے ان کے چہرے پر نمودار ہو گئے۔ حالاں کہ سردی اتنی تھی کہ قریب قریب بیٹھنے سے ایک دوسرے کے جسم کی حدت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ علی بابر کی پیشانی اور چہرے پر یہ قطرے پسینے کے نہیں یہ بابا کی پانی میں ڈوبی ہوئی انگلیوں کے وہ چھینٹے تھے جو بابا نے ان کے چہرے اور سینے پر چھڑ کے تھے۔ دیکھنے والی آنکھیں بلکہ علی بابر کو اپنی نظر میں رکھنے والی آنکھیں حیران تھیں۔ پہلے حسد کا نادیدہ احساس، پھر دوڑتے ہوئے قدموں سے پھولتا پچکتا سینہ پھر چہرے پر اطمینان کی لہر اور اب پیشانی اور چہرے پر پسینے کے قطرے ان تمام کارکن ساتھیوں ہی سب سے کم عمر لڑکا جو صرف ۲۸ برس کا تھا بقیہ سب ۳۵ سے اوپر کے لوگ تھے۔ اس کا نام رابرٹ وولف رام تھا اور رابی کہلاتا تھا۔ اپنے رڈیوں میں سب کے ساتھ شوخ اور چنچل بھی تھا۔ چونکہ سینئرز کا احترام بھی کرنا جانتا تھا اس لیے اس کی شوخی اور چنچل پن کو برداشت کر لیا جاتا تھا۔ وہ لہراتا ہوا کے انداز میں علی بابر کے قریب آیا اور لڑکیوں کے انداز میں ان کے ماتھے سے اپنی ہتھیلی سے پوچھا یہ کہتے ہوئے کہ اس سردی میں علی بابر تمہارے ماتھے پر پسینے کے قطرے کیوں آ گئے ہیں۔ اور تھوڑی ہی دیر میں وہ زور سے چلایا مختلف بالکل مختلف یہ عام پرفیوم کی خوشبو نہیں ہے کچھ اور ہے پھر اس نے اپنی ہتھیلی لگ بھگ ہر ایک کی ناک کے قریب لایا۔ اس پسینے میں سب نے ایک فطری خوشبو محسوس کی۔ دریاؤں کے کنارے کائی آمیز جنگل کی خوشبو سب نے حیرت سے پوچھا علی یہ کون سی پرفیوم ہے۔ خوشبو بھری ہتھیلی کے کے بی کو نہیں سنگھائی تھی۔ وہ سب سے زیادہ محترم بن کر سب سے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ سب سے الگ اس نے بھی کہا رابی مجھے بھی سنگھاؤ رابی اپنی ہتھیلی کے کے بی کے ناک کے پاس لے گیا۔ کے کے بی اُچھلنے کے انداز میں اپنی نرم گھومنے والی نرم کرسی میں اور دھنس گیا پھر وہ آہستگی سے اُٹھ کر علی بابر جسے سب علی کہتے تھے علی کے پاس گیا۔ اس کی ہتھیلی لے کر سونگھی اور پھر بے ساختگی سے چومنے لگا۔ ساتھ ہی بلند آواز سے کہنے لگا۔ یہ انسان کی بنائی ہوئی خوشبو نہیں ہے۔ یہ پھولوں کی خوشبو بھی نہیں ہے۔ یہ تو وہ خوشبو ہے کہ برسوں کی تپسیا کے بعد جب لارڈ کرشنا درشن دیتے ہیں تو درشن سے پہلے یہی خوشبو آتی ہے۔ یہ کیا ہے علی۔ علی بابر کی نفاست اور طہارت اور ایک طرح کی نزاکت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ نرم کلام خوش رو اور مسکراتے ہوئے انہوں نے جواب دیا۔ دراصل یہ ٹوائلٹ سوپ اور آفٹر شیو وغیرہ کی ملی جلی خوشبو ہے۔

''نہیں'' کے کے بی نے بہت مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ علی یہ بتاؤ کہ لارڈ کرشنا کیسے تم پر مہربان ہوئے اور کب تمہیں درشن دیے میں ان کا بھگت انکا داس ہوں۔ مجھے بتاؤ میں تمہارے پاؤں دھو کر پیوں گا۔ پھر وہ ایک شیشے کے باؤل میں پانی لے کر آیا۔ اس نے رابی کا وہ ہاتھ جس سے اس نے علی بابر کی پیشانی پونچھی تھی وہ ہاتھ اس

باؤل میں ڈبو دیا پھر کے کے بی کے کہنے پر اس نے کئی مرتبہ علی بابر کی پیشانی کو اپنے نم ہاتھوں سے پونچھا اور ہر مرتبہ پونچھا ہوا ہاتھ پانی کے باؤل میں ڈبو دیا۔ پھر وہ باؤل باری باری سب کے قریب لایا گیا۔ اس سردی کے باوجود کمرے میں کائی بھری نم آلود کیوڑے کی خوشبو پھیل گئی۔ سب نے محسوس کیا مگر علی بابر حیران ہونے کے باوجود اسے بھی کوئی چمتکار سمجھ رہا تھا۔ شیر نے اپنی پیٹھ سواری کے لیے پیش کی۔ اس مرتبہ جلالی بابا تک پہنچنے میں بالکل دیر نہیں لگی۔ بابا نے مسکرا کر کہا تمہارے اطمینان قلب کے لیے یہ ضروری تھا۔ ورنہ تم آدمی تو ہوا اور مٹی سے بنے ہو۔ مٹی گلاب کے قرب سے مہک اٹھتی ہے۔ تم اب مہک چکے ہو جاؤ اور عام آدمی بن جاؤ۔ تمہارے کسی روّیے میں خصوصیت کی جھلک نہیں آنی چاہیے۔ یہ شیر آخری مرتبہ تمہیں پہنچانے کے لیے جائے گا پھر تمہارے بلانے پر بھی نہیں آئے گا۔ ریل یا جہاز میں بیٹھ کر آؤ جاؤ۔ عام آدمی بن جاؤ۔ جاؤ۔ آخری جاؤ سنتے ہی شیر علی بابر کو پیٹھ پر بٹھا کر اڑ چکا اور ایک ہی چھلانگ میں ۳۵ ویں فلور میں ان کے آفس میں موجود تھا۔ دفتر کا وقت ختم ہونے والا تھا۔ علی بابر خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔ ۵ بجتے ہی سب کے ساتھ وہ بھی اٹھے۔ مسز ہوشو نے کیبنوں کو تالا لگانا شروع کر دیا۔ آخری تالا لگا کر اس نے لپک کر کے کے بی کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ آج کی شام میرے ساتھ گذارو ہم دونوں ساتھ ہی ڈنر کریں گے۔ دونوں نہیں تینوں کے کے بی نے اسی طرح علی بابر کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ تینوں چالیسویں فلور کے روف ٹاپ پر بنے بار میں بیٹھے تھے۔ مسز ہوشو بیئر پر بیئر بوتلیں خالی کر رہی تھیں۔ کے کے بی صرف ریڈ وائن کی چسکیاں لے رہا تھا اور علی بابر تو ببلنگ واٹر سے بھی گریز کرتے تھے۔ بابر کے سامنے فریش آرنج جوس رکھا تھا۔ جسے وہ ہلکی سی کراہت کے ساتھ پی رہے تھے۔ اس کراہت کے احساس کے ساتھ کہ اس گلاس میں بھی کبھی نہ کبھی تو بیر یا وائن پی گئی ہوگی۔ حالاں کہ گلاس شفاف اور دھلا ہوا تھا۔ مگر کسی برتن کو یا اپنے بدن کو طاہر رکھنے کی تمیز ان لوگوں کو کہاں۔ اب یہ فطری مجبوری تھی عام آدمی فطری مجبوری کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ علی بابر اب عام آدمی بن چکے تھے یعنی ترک ترک کے اس مرحلے پر پہنچ چکے تھے جس مقام پر پہنچنے کے بعد مرشد اپنے کامیاب مرید کو چوتر کی ٹوپی پہناتا ہے۔ چوتر کی ٹوپی پہننے کا حق دار ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے میاں علی بابر بابا کا کہنا مانو عام آدمی بن جاؤ۔ تم نے ترک دنیا کے دوران مجاہدے میں کسی بھی صورت میں الکوحل کو ترک کر دیا تھا اب اس ترک کو بھی ترک کرو۔ ریڈ وائن میں الکوحل کی مقدار بہت کم ہوتی ہے۔ یہ لوگ اصرار بھی کر رہے ہیں اور تمہیں عام آدمی بننا ہے۔ عام آدمی تو یہ سب کرتا ہے۔ کیا حرج ہے ان کے دل میں بائیں طرف والی بصیرت نے آنکھ ماری۔ انہوں نے چوڑے جبڑے اور مضبوط جسم والی میکسیکن ویٹرس کو آواز دی اور اپنے لیے ریڈ وائن کا آرڈر دے ہی دیا۔ دو تین چسکیاں لیتے ہی وہی شیر ان کے سامنے تھا جس کے بارے میں جلالی بابا نے کہا تھا کہ اب یہ تمہارے بلانے پر بھی تمہارے پاس نہیں آئے گا۔ مگر وہ سامنے موجود تھا۔ اس کے سر پر دو کان آگے اور دو کان سر کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ ایک نظر میں لگتا تھا کہ اس شیر نے

بھی چوتر کی ٹوپی پہنی ہوئی ہے۔انہوں نے غور سے دیکھا سوائے جسم کے جو شیر کی طرح تھا چہرہ بالکل کے کے بی کی طرح لگ رہا تھا جس نے چوتر کی ٹوپی پہن لی ہو اور بھگتی تحریک سے الگ ہو کر چوتر کی مسلک میں شامل ہو گیا ہو پھر کیا ہوا؟ پوچھنے والے نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

کیا ہونا تھا یہ تو معمولات میں سے تھا کہ مسز ہوشو جس کے شوہر فلپائن میں تھے نے کے کے بی سے دوستی بڑھالی۔لیکن کے کے بی کبھی مسز ہوشو کے بیڈروم میں جانے کے لیے تیار نہیں ہوا اور کے کے بی کے کمرے میں تقدیس کی وہ سلیقگی موجود تھی جس کے سبب کے کے بی کے بیڈروم میں بھی وہ کبھی حد ادب سے آگے نہ بڑھ سکیں۔

ادھر علی بابر نے جونہی ریڈ وائن کی دو تین چسکیاں لیں چوتر کی یعنی چوگوش شیر ان کے سامنے ظاہر ہوا۔اس نے علی بابر کی رانوں سے سر کراتے ہوئے آگے بڑھ کر اپنی پیٹھ سواری کے لیے پیش کی۔علی بابر کی آنکھوں میں نہیں لیکن خون میں خمار کی گردش شروع ہوگئی۔یہ زندگی میں ان کا پہلا تجربہ تھا دوسری صبح اتوار کی صبح تھی۔علی بابر اچانک اس وقت جاگے جب اتوار کی صبح اپنے اپارٹمنٹ کے بیرونی دروازے کو کھول کر اندر داخل ہوئے۔اپارٹمنٹ میں پہلا قدم رکھتے ہی انہیں یوں لگا جیسے وہ کوما میں تھے اور اب اچانک اعصاب کے تمام صحت مند نظام کے ساتھ کوما سے باہر آگئے ہوں ’’تو پھر یہ رات میں نے کہاں اور کس غفلت میں۔آثار وطبیعت میں موجود اداس بے چینی گردن اور کالر پر ریڈ وائن اور لپ سٹک کی گلکاری تو کیا رات میں نے مسز ہوشو کے ساتھ گذاری‘‘ ان کے سینے پر کسی نے دھموکا لگا۔ان کا سانس لگ بھگ گھٹنے لگا۔آرنج جوس کے یخ ٹن نے سینے کے اندر محسوس ہونے والی بے چین مایوسی اور سینہ توڑ دینے والے دھماکے کو کچھ کم کیا شیر پھر نمودار ہوا۔اس مرتبہ کے دو ہی کان تھے۔شیر کی پیٹھ پر بیٹھتے ہی انہیں محسوس ہوا کہ وہ کسی پناہ میں آگئے۔گذری ہوئی غفلت کے اندھیرے میں کچھ کچھ روشن ہو رہے تھے اور انہیں اپنے آپ سے گھن آرہی تھی۔شیر پہلے انہیں کے کے بی کے اپارٹمنٹ میں لے گیا۔جہاں کے کے بی ہیرے کی طرح نظر آرہا تھا۔شاید وہ اپنے بھگتی آسن سے ابھی فارغ ہوا تھا اور مختصر سفید لنگوٹ نما دھوتی اور گہرے سرخ رنگ کے تلک میں واقعی تراشہ ہوا ہیرا معلوم ہو رہا تھا ہندو ہونے کے باوجود علی بابر نے کے کے بی کے چہرے پر تقویٰ اور طہارت کا نور محسوس کیا۔

پھر کیا ہوا؟ پوچھنے والے نے پوچھا۔

کیا ہونا تھا۔کے کے بی کی سانولی رنگت شہابی رنگت میں تبدیل ہوگئی۔وہ اپنے سڈول جسم شہابی رنگت کے ساتھ اپنے چہرے پر طہارت وتقویٰ کا جمال لیے واپس اپنے وطن لوٹ گیا اور علی بابر وہ وہیں رہ گئے۔وہ مسز ہوشو کو ہر ماہ پیپر میرج کا بھتہ دیتے ہیں۔مسز ہوشو نے دولت مند ترین شخص کی بیوہ کی طرح بود وباش اختیار کر رکھی تھی۔غنڈوں کا ایک گینگ پال رکھا تھا۔جو مسز ہوشو کے لیے دن رات کام کرتے اور بھتہ وصول کرنے میں ایک

سینٹ کی رعایت دینے کے لیے بھی تیار نہ ہوتے۔ وہ وہیں ہیں اور خونیں پنجوں میں دبے ہوئے اپنے ہونے کا خراج ادا کر رہے ہیں۔ وطن واپس جانے کے بارے میں وہ سوچتے بھی نہیں ایک ہی بہن تھی جو کسی اوباش کے دام میں گرفتار ہوکر اس کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ ماں اس صدمے سے مرگئی تھی۔ باپ کا بچپن میں ہی انتقال ہو چکا تھا۔ ماں نے اپنی زندگی میں علی بابر کی آمدنی سے ایک کوٹھی تعمیر کر لی تھی جو علی بابر کے نام تھی مگر جس پر اس کی بہن اس کے اوباش شوہر اور اس کے آوارہ بچوں کا قبضہ تھا انہوں نے خود کو مسز ہوشو کے پنجوں میں ہی رہنے دیا۔

پوچھنے والے نے پوچھا کہ کہیں اس کہانی میں دو دین اور دو ملکوں کا مذاق اڑاتے ہوئے موازنہ کیا گیا ہے نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ سیدھی سیدھی ایک شہر کی کہانی ہے جس کے چار کان تھے جن میں سے دو مسز ہوشو نے کاٹ لیے تھے اور آم کی کھٹائی کی طرح سکھا کر ایک جار میں بند کر دیے تھے۔ البتہ یہ بات بھی درست ہے کہ سوکھی ہوئی کھٹائی کو ذرا سی بھی نمی مل جائے تو اس کی کھٹاس اور بڑھ جاتی ہے۔

مگر تم یہ کیا اول فول لکھے جا رہے ہو!

یہ اول فول نہیں ہے۔ یہ نظیر اکبر آبادی کی نظم ''آدمی نامہ'' کے ایک بند کی تشریح ہے۔ جوان کو تارتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی!

❀❀

Address:
Station Director
Radio Pakistan
Karachi.

مولوی قاسم بہت مصروف ہے

محمد حامد سراج

مجھے کئی دن سے اتنی فرصت بھی میسر نہیں ہے کہ میری اپنے آپ سے ایک ادھوری ملاقات ہو جائے۔ مکمل ملاقات کا امکان تو عرصہ ہوا معدوم ہو چکا۔ میں نے اپنی مصروفیات کچھ اس طرح ترتیب دے رکھی ہیں کہ مہینے میں ایک دن کھل کے رو لینے کے لیے نکال لیتا ہوں لیکن گزشتہ ماہ ایسا زندگی کی بھیڑ میں گم ہوا کہ رونے کے لمحات ہاتھ سے نکل گئے۔ میں نے سوچا چلو اگلے مہینے اپنا معمول پورا کرلوں گا۔

لیکن دوسرے مہینے بھی زندگی کی مصروفیات نے اُلجھائے رکھا۔

رونے کا عمل ترک ہونے سے ایسا لگا جیسے زندگی نے کوئی ٹکڑا کاٹ کے وجود کو اپاہج کر دیا ہے۔ اپاہج زندگی گزارنا آسان کام ہے کیا......؟ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے موجودہ نسل مکمل اپاہج ہو چکی ہے۔ وقت کے گھومتے پہیے نے انسان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور ہر انسان بے سمت گھوم رہا ہے۔ وہ رات میں جب اپنے بستر پہ آ کے گرتا ہے تو اسے یاد آتا ہے یہ تو وہی بستر ہے جسے صبح دم اس نے چھوڑا تھا۔ انسان بہت مصروف ہے وہ سوچتا ہے اور بھاگتا ہے۔ فاصلہ ہی کتنا ہے، قبر تک ہی تو جانا ہے وہ پھر بھی برق رفتار ہے، اسے اپنی ذات کے لیے بھی ایک لمحہ میسر نہیں۔ وہ اپنے ساتھ ایک مکمل دن گزارنے کی خواہش تو رکھتا ہے لیکن دن تو کیا اسے ایک ساعت بھی نصیب نہیں۔ ایسے میں وہ اپنی تھکن اتارنے کو کسی روز اکیلے بیٹھ کے جی بھر کے رونا چاہتا ہے۔

ایسے میں مجھے مولوی قاسم بہت یاد آرہا ہے۔ مولوی قاسم سے جب میری ملاقات ہوئی وہ وقت کے پہیے سے باہر کھڑا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ زمین پر ایک انسان تو ایسا ملا جسے ابھی وقت کے پہیے نے اپنی لپیٹ میں نہیں لیا۔ مولوی قاسم سیدھا سادا ایک دینی مدرسے کا مدرس تھا۔ قناعت پسند، خوش اخلاق، ملنساری اور مہمان نوازی اس نے اپنے آباء سے ورثے میں پائی تھی۔ عصر کی نماز پڑھ کے وہ اکثر مسجد کی مغربی سمت ٹیوب ویل پر آ بیٹھتا، میں بھی اپنی مصروفیات سمیٹ کر اس کے پاس آ جاتا۔ ہم بہت سے موضوعات پر بات کرتے، ہمارے پاس سے چرواہا اپنے ریوڑ لے کر گزرتا، جوائے خیل برادری کا محمد شیر اپنی بھینسوں کی پیٹھ تھپتھپاتا روزانہ اپنی بھینسیں نہلانے نہر پر لے جاتا۔ ہم وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے اور مولوی قاسم کا بیٹا مٹی کے دو کٹورے اور تام چینی کی چینک میں گڑ والی چائے رکھ جاتا۔ اس چائے کا ذائقہ ابھی زبان پر تر و تازہ ہے۔

کبھی کبھی جب مجھے تنہائی کاٹتی یا مسائل کے کانٹے اپنے وجود سے چنتے چنتے میری پوریں زخمی ہو جاتیں تو میں شام کے بعد مولوی قاسم کے گھر جو ٹیوب ویل کے ساتھ تھا کا دروازہ کھٹکھٹاتا، مولوی قاسم کے ساتھ تام چینی

چینک میں گڑ والی چائے بھی آجاتی اور ٹیوب ویل کے ملگجے اندھیرے میں ہم باتیں کرتے رہتے، دل کے ساتھ آنکھیں بھی اپنا دکھ بانٹ لیتیں، باوضو آنکھوں سے ہم جدا ہوتے تو رُوح شانت اور سرشار ہوتی۔

ایک دن وقت نے پہیے کو زور سے گھما دیا۔

پہیہ گھومتے گھومتے رکا تو مجھے سکتہ ہو گیا......!

میں ہنجر کھڑا تھا۔

مولوی قاسم کو وقت کا پہیہ گھما کر کسی اور شہر لے گیا۔

میں ٹیوب ویل کے کنارے اپنے آنسوؤں سمیت تنہا رہ گیا۔

بہت سال گزر گئے۔

ایک روز میں نے اپنی مصروفیات کو تالا لگایا، ذمہ داریوں کو زنجیر ڈال کے ایک طرف پھینکا اور مولوی قاسم کی تلاش میں نکلا۔ مسافت قطع کر کے جب میں مولوی قاسم کے گاؤں پہنچا دو پہر ڈھل رہی تھی۔ مولوی قاسم اسی خلوص اور تپاک سے ملا۔

چائے آگئی لیکن چینی والی......

میرے من میں بہت سی باتیں تھیں۔

ہم ایک زمین کے وسیع کھیت میں چار پائیوں پر بیٹھے تھے۔ میں تھا، مولوی قاسم اور اس کا بیٹا......!

چار پائیوں کے ساتھ موٹر سائیکل کھڑا تھا۔

مولوی قاسم کو قریبی شہر میں ایک ضروری کام سے جانا تھا۔

اس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کیا۔

پہیہ گھوما......موٹر سائیکل کا، یا وقت کا......؟

پہیہ گھومتے گھومتے رکا تو مجھے سکتہ ہو گیا......!

میں ٹیوب ویل کے کنارے اپنے آنسوؤں سمیت تنہا کھڑا تھا۔

❁❁

Address:

Post Office Chashma Barrage
District : Mianwali : 42030

لختِ جگر

احسان بن مجید

معلوم نہیں لوگوں کی سونگھنے کی حس کیوں شدت اختیار کر جاتی ہے جب کسی جوڑے کی شادی کو پانچ سات ماہ گزر جاتے ہیں۔ خواتین ''ہائے اللہ'' سے بات شروع کرتے ہوئے دلہن سے کرید کا آغاز کرتی ہیں، چہروں پر یوں ہمدردی لیپ لیتی ہیں جیسے تھوڑی دیر بعد کوئی خبر نہ آئی تو سب فوت ہو جائیں گی، دولہا کے دوست، رشتہ دار اس کی جان کو آئے ہوتے ہیں، ہر ملاقات پر کوئی نئی تازہ خبر، اور کیا حال چال ہیں، کی مسلسل نشتر زنی ہوتی رہتی تو وہ سوچتا اونٹ نہیں کودتا، بورے کودتے ہیں، اس کے علاوہ بھی اسے جانے کتنے پل صراط عبور کرنے پڑتے تھے۔ اپنے گھر سے پہلی سوئی اس کے سینے میں اس وقت چبھی تھی جب اس کے ابا نے شادی کے دو سال بعد ہی بہو کو طعنوں کی زد پر رکھ لیا تھا۔ اس کو پاس بٹھا کر کہتے ''نبیل، جس پودے کے ساتھ پھول نہ لگیں، جس درخت پر پھل نہ آئیں، بجائے اس کے کہ وہ مالی پر ناامیدی کے کنکر پھینکتے رہیں، کیوں نہ انہیں جڑ سے اکھاڑ کر پھول دار پودا لگایا جائے جس پر پھول لگیں، چمن مہکے اور خوشبوئیں بکھریں۔ دیکھو بیٹا! جس زمین کی فطرت بنجر ہو اس میں بیج ڈالنے والا کسان کبھی لہلہاتی فصل نہیں دیکھ سکتا، بارش کتنی ہی برس جائے، اس زمین پر کوئی اثر نہیں ہوتا، میری بات مانو اور دوسری نبیل کی شہ رگ پر جیسے کسی نے ہاتھوں کا دائرہ تنگ کر دیا ہو۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر وہاں سے اُٹھ جاتا تھا، کیا کہتا، کس سے کہتا، ورنہ ایسے حالات میں کیا نہیں کہا جا سکتا۔ آٹھ سال کا عرصہ بیت گیا ایسی ہی کڑوی کسیلی باتیں سنتے، دل کو سمجھاتے، صبر کرتے اور مریم کو حالات سے سمجھوتہ کرنے کی تلقین کرتے لیکن اس عرصہ میں ابا کے جسم سے مسلسل گوشت رخصت ہونے لگا، ڈاکٹر نے ذیابطیس کی دوائیں تجویز کر دیں۔ یہی دن تھے جب مریم نے اس کے کان میں کچھ کہا تھا۔ اسے لگا بنجر دھرتی لہلہانے لگی ہے، پودوں کے ساتھ پھول کھل اٹھے ہیں، چمن مہک اُٹھا ہے اور ہر طرف خوشبوئیں بکھر رہی ہیں، یہ خبر ابا تک پہنچی، خوشی سے پرہیز چھوڑ دیا اور مریم کے ساتھ شفقت سے پیش آنے لگے لیکن تین ماہ بعد وہ سوگوار دوپہر آ گئی جب نبیل کے آگے لوگ اس کے ابا کی وفات پر فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ مریم بھی ابا کے انتقال پر سسکیاں بھر کے روئی تھی، وہ ابا سے کہنا چاہتی تھی کہ اب یہ زمین بنجر نہیں رہی، اس میں پھول کھلنے والا ہے۔ یہ کہنے کے لیے اسے تھوڑا عرصہ درکار تھا لیکن زندگی تو ہر لمحہ اک ٹمٹماتا دیا ہے، موت کا ایک جھونکا اسے کسی وقت بھی گل کر سکتا ہے، اس کی یہ خواہش دل میں دبی کی دبی رہ گئی یوں جیسے ابا کھلا پھول دیکھنے کی آرزو کفن میں لپیٹ کر قبر میں ساتھ لے گئے۔ ابا کی موت کا رنج مدھم پڑا تو ایک خوشی نے نبیل کے گرد ہالہ بنا لیا اور وقت نے انتظار کا روپ دھار لیا، انتظار جو انسان کو اندر سے کھرچتی ہے، بے چینی اور اضطراب

طویل ہوتے جاتے ہیں لیکن فطرت ان سب جذبوں سے بے نیاز ہوتی ہے، ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے، اس سے ایک لمحہ پہلے یا تاخیر سے نہیں ہو سکتا۔ دیوار گھڑی کی سوئیاں وقت کو آگے دھکیلتی رہیں یوں پتہ نہیں پہلے دن آتار ہا یا رات بالآخر وہ وقت، وہ لمحہ آ گیا جس نے نبیل کی مسافت کو منزل آشنا کیا۔ اسے دفتر میں فون سے اطلاع ملی، بیٹا ہوا ہے۔ اس نے ریسیور، کریڈل پر واپس رکھنے کے بعد جو پہلا کام کیا وہ سجدۂ شکر تھا، بوٹوں سمیت، ننگے سر، دفتر کے فرش پر، اس فرش پر، جس پر لوگ جانے کہاں کہاں سے آتے، مسلم بھی اور غیر مسلم بھی، سب کے سامنے، سجدے سے اٹھ کر کھڑا ہوا تو پیشانی، ناک، ہتھیلیاں اور گھٹنوں سے پتلون ریت اور دھول سے اٹ چکی تھیں۔ مراد بر آئے، خواہش کی تکمیل ہو تو سجدۂ تشکر کے لیے مسجد ضروری نہیں ہوتی۔ واش روم میں جا کر اس نے منہ ہاتھ دھویا، پتلون جھاڑی اور واپس آتے ہی مبارک بادوں کا طوفان اس کا منتظر تھا، اس نے سب کا شکریہ ادا کیا اور چھٹی لے کر گھر روانہ ہو گیا۔ رکشا آدھا گھنٹہ سڑک پر دوڑتا رہا۔ آج گھر کیوں اتنی دور ہو گیا ہے، پہلے ہی راستہ دس منٹ میں طے ہو جایا کرتا تھا، یا یہ ایک احساس تھا جو عموماً خوشی کے موقع پر ہوتا ہے۔ اسی سرشاری میں وہ گھر پہنچ کر مریم کے کمرے میں گیا، دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے، اس مسکراہٹ میں ایک آسودگی تھی، دونوں نے ایک بت تخلیق کیا تھا، ننھے سے انسان کا بت، جو اس وقت مریم کے پہلو میں پڑا یوں سو رہا تھا، جیسے جاگنے کے لیے عمر پڑی ہو، نبیل نے بڑھ کر وہ پوٹلی سی اٹھائی، گال چومے اور پھر غور سے دیکھا، ''بنا بنایا آپ پر ہے'' مریم نے پوٹلی اس سے واپس لے لی۔ پتا نہیں عورتیں یہ اندازہ کیسے لگا لیتی ہیں اور ہوتا بھی سو فی صد سچ ہے۔ بیٹے کا نام سلمان تجویز ہوا، سلمان نبیل...... اور پھر نبیل کو یوں لگا جیسے وہ عمر کی سیڑھیاں اُترنے لگا ہو، دونوں اس کی تربیت میں جٹ گئے۔ وقت کا پہیہ چلتا رہا، کئی جون آئے گزر گئے، جانے کتنے دسمبر بھی بیت گئے، سلمان بی اے کر چکا تھا اور اب اس نے یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی، نبیل نے کچھ دن سوچنے میں صرف کر دیے، سوچنا تو اک بہانہ تھا در اصل سلمان کی جدائی نا قابل برداشت تھی، مریم کو جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ جن بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں تھیں، وہاں حالات اچھے نہیں تھے، کوئی نہ کوئی حادثہ ایسا ہو جاتا تھا، جس میں کئی انسان ضائع ہو جاتے تھے، ضائع کیا ہوتے تھے، تکہ بوٹی ہو جاتی تھی، پکڑا کوئی بھی نہیں جاتا تھا، پکڑا کیسا جاتا، کسی کی پیشانی پر تو لکھا نہیں ہوتا۔ بس یہی فکر دونوں کو کھرچے جا رہی تھی اور سلمان کی ضد کا گراف بھی نہیں گر رہا تھا، ایک بیٹا تھا، لاڈلا، مانتے ہی بنی۔ لیکن دونوں نے کچھ شرائط سلمان کے سامنے رکھیں جیسے ہر دوسرے تیسرے دن فون پر وہ اپنی خیریت بتائے گا، سورج غروب ہونے کے بعد کیمپس سے باہر نہیں جائے گا اور وہاں بھی نہیں جائے گا، جہاں لوگوں کا اکٹھ رہتا ہو، سلمان زیر لب مسکراتا رہا اور اثبات میں سر بھی ہلاتا رہا۔

''بیٹا ہماری جان پہ بنی ہے اور تم مسکرا رہے ہو'' نبیل کی نظر اس کے چہرے پر اٹکی ہوئی تھی۔

''نہیں بابا! میں تو اس بات پر مسکرا رہا تھا کہ آپ ابھی تک مجھے چھوٹا سا، نادان سا سلمان سمجھتے ہیں، میں

نے آپ کی تمام نصیحتیں پلے باندھ لی ہیں، آپ بالکل پریشان نہ ہوں، امی آپ بھی، دیکھیے ناں کتنے لوگوں کے بچے وہاں پڑھ رہے ہوں گے۔'' مریم کی آنکھیں چھلک پڑیں اور وہ پلو سے آنسو خشک کرنے لگی، نبیل جانے کیوں واش روم میں منہ، ہاتھ دھونے چلا گیا۔ اور پھر وہ وقت آ گیا جب سلمان کو یہاں سے دور ایک بڑے شہر کے لیے روانہ ہونا تھا، نبیل اسے اسٹیشن تک چھوڑنے گیا، گاڑی حسبِ معمول ایک گھنٹہ تاخیر سے آئی، اتنی دیر وہ بچی کچھی باتیں بھی سلمان کے ذہن میں انڈیلتا رہا، سلمان کو کھڑکی کے ساتھ سیٹ ملی تھی، آخری وسل بجاتے ہی گاڑی کھسک پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ جا وہ جا، بہت دور تک سلمان کا ہاتھ اسے خدا حافظ کرتے دکھائی دیتا رہا، گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی تو وہ یوں پلٹا جیسے لوٹ کر گھر نہ جانا چاہتا ہو بلکہ یہیں کہیں بیٹھ کر سلمان کی واپسی کا انتظار کرنا چاہتا ہو۔ یوں بھی اب گھر میں سوائے مریم کے اور کون ہوگا۔ جسے دیکھتے ہی اپنی طاقت بڑھنے کا احساس ہوگا اور مریم اسے اکیلا گھر میں داخل ہوتے ہی پوچھے گی، ''میرا بیٹا کہاں ہے، میرا سلمان کہاں چھوڑ آئے ہو'' اور پھر اس کی آنکھوں سے دریا بہہ نکلیں گے، نبیل کے پاؤں میں جیسے زنجیر سی پڑ گئی، ہولے ہولے قدم اُٹھاتا اسٹیشن سے باہر آیا اور رکشا پکڑ کر گھر پہنچ گیا۔ دہلیز پر چند لمحے رکنے کے بعد وہ اندر داخل ہوا تو مریم کچن سے نکل کر سامنے آ گئی، دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، مریم کی آنکھیں لال سرخ ہو رہی تھیں، وہ روتی رہی تھی اور اب پھر آنکھوں کے کٹورے آنسوؤں سے لبالب تھے، وہ تھوڑی دیر اس کے سامنے رکا، شاید اس کا بھی دل بھر آیا تھا اس لیے کمرے میں چلا گیا، مریم بھی کمرے میں پہنچ گئی، دونوں کچھ دیر حیران ویران اور چپ چاپ بیٹھے رہے یوں جیسے ایک دوسرے سے بھیگی پلکیں چھپا رہے ہوں۔

''مریم، تم پریشان نہ ہو، میں نے سلمان سے کہہ دیا تھا، کیمپس پہنچتے ہی وہ ہمیں فون کرے گا، اور پھر، دیکھو یہ ہمارے بیٹے کے مستقبل کا معاملہ ہے، تم ماں ہو اور ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو اور میں .... پدری شفقت کے ہاتھوں، سلمان، ہم دونوں کا بیٹا ہے، ہمارے جسم کا حصہ ہے، ہمارا خون ہے لیکن اس کی آئندہ زندگی کی ذمہ داری بھی ہم پر عائد ہوتی ہے، کچھ عرصے کی جدائی ہم دونوں کو ایک دن سلمان کے سامنے سرخرو کرے گی''! اس نے مریم کی آڑ میں خود کو بھی تسلی دی۔

رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے جب فون کی گھنٹی بجی تھی، تب تک ٹیلی فون سیٹ ٹیبل پر رکھے دونوں انتظار کرتے رہے، نبیل نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔

''السلام علیکم بابا!''

''سلمان، وعلیکم السلام، بیٹا خیریت سے پہنچ گئے، کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی''

''نہیں بابا، ساڑھے پانچ بجے کیمپس پہنچ گیا تھا، کمرہ مل گیا ہے، روم میٹ بہت اچھے لوگ ہیں''

''لو امی سے بات کرو!'' نبیل نے ریسیور مریم کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''سلمان بیٹا!''

''جی امی!''

''کھانا کھالیا!''

''جی ہاں، کھالیا، امی آپ پریشان نہ ہوں، یہاں سب کچھ ہے، سوائے آپ دونوں کے، اچھا، فون بند کرتا ہوں، اپنا خیال رکھیے گا، اللہ حافظ'' اور رابطہ منقطع ہوگیا۔

دونوں کے چہرے پر اداسی میں لپٹی ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ دن گزرتے رہے اور یوں گزرے کہ سلمان نے ایم اے کا دوسرا سال بھی مکمل کرلیا اور فون کرکے گھر اطلاع دے دی کہ وہ مزید چند دن دوستوں کے ساتھ یہاں رہے گا لیکن آنے سے پہلے فون ضرور کرے گا۔ حالات زیادہ خراب ہوگئے، طلباء نے کلاسوں کا بائیکاٹ کیا اور جلوس کی صورت سڑک پر آگئے، سلمان اور اس کے دوست بھی جلوس میں شامل تھے، نعرہ بازی ہو رہی تھی کہ ایک نوجوان جس کی عمر کوئی بیس بائیس سال ہوگی، چوڑا چہرہ اور چہرہ پر داڑھی، شلوار قمیص میں ملبوس، آنکھوں میں وحشت لیے لوگوں میں رستہ بناتا جلوس کے وسط میں پہنچ گیا۔ اس نے ایک بار دائیں دیکھا، ایک بار بائیں اور پھر دایاں ہاتھ ہوا میں لہرا کر بلند آواز سے نعرہ تکبیر کہا لیکن اسی لمحے اللہ اکبر کہنے والوں کے چیتھڑے اڑ گئے، کچھ پتا نہ چلا کوئی کہاں گیا، سڑک پر خون اور اعضاء دور تک بکھر گئے تھے، پل بھر میں قیامت برپا ہوگئی تھی، خودکش حملہ ہوا تھا، ایئر میڈیا نے فوراً Breaking News چلادی۔

نبیل سنتے ہی گھر پہنچا، اس کا رنگ اڑا ہوا تھا اور دل بیٹھ رہا تھا، آتے ہی اس نے ٹیلی ویژن آن کیا تو دہشت گردی کی بھینٹ چڑھنے والے طلباء کے نام چل رہے تھے کہ اسکرین پر سلمان نبیل پڑھتے ہی اس نے دو تھپڑ اپنے منہ پر مارا، مریم اپنا سینہ پیٹنے لگی اور سر کے بال نوچنے لگی، لوگ نبیل کے پاس افسوس کے لیے آنے لگے۔ گلی مردوں اور عورتوں سے بھر گئی تھی، نبیل دیوانہ وار دوڑتا ہوا گلی میں نکل آیا، ''لوگو، میرا بچہ، میرا جوان بیٹا، میرا سلمان...... ظالموں، میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا، میرے ساتھ تمہاری کیا دشمنی تھی، مجھے بھی مار دیا ہوتا، میرے اعضاء بھی بکھر گئے ہوتے، ہائے اللہ، میرا بچہ، میرا لختِ جگر......'' گلی میں کھڑے تمام لوگ سلمان کی موت پر آنسو بہا رہے تھے۔

❁❁

Address:
Pasha Petroleum Service
College Road, Attock (NWFP)

لاحاصلی کا حاصل

سائرہ غلام نبی

''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

اس خواہش نے اچانک ہی اس کے اندر سے جنم لیا اور وقت مصروفیت، تھکن بھول کر اس کے پیچھے چل دیا۔

گداز جسم کی بھرپور وجود رکھنے والی اس اجنبی لڑکی کے چہرے کے نقوش میں بڑی ہی مانوسیت، اپنائیت اور جاذبیت کی ایک ایسی کشش تھی، اسے لگا وہ اس کو سمیٹ کر اپنے اندر گم کر سکتی ہے۔

وہ اس کے قرب کی خواہش میں مچلتے دل کو سنبھالتے، اس سے ذرا اور قریب ہوا تو زندگی کو پُر جوش کر دینے والی مہک نے اس کو لپیٹ میں لے لیا۔ اسے ایسا لگا کہ وہ اس سے اپنی خواہش کہہ دے گا تو اس کے اندر حبس ٹوٹ جائے گا اس کا لمس پا جائے گا تو اس کے اندر کی گھٹن پل میں دم توڑ جائے گی۔ یہ گھٹن کی کیفیت اچانک ہی اس پر طاری نہیں ہوئی تھی۔ جانے برسوں کی تھکان تھی زندگی کا الجھاؤ، کسی بہت مانوس چہرے کا اجنبیت کا برتاؤ، یا پھر دیکھتے ہی دیکھتے وجود کو سایوں میں ڈھلتے اور سایوں کو سمٹتے دیکھنے کی وحشت۔ معمول کے روز و شب نے اس کے دماغ میں عجیب سی سرسامی کیفیت گھول کر رکھ دی تھی۔

اور یوں آج کا دن، بہت عجیب تھا۔ وہ صبح کی غنودگی سے کروٹ لے کر جاگا تو ایک اداس دن کی خبر اسے بستر پر ہی مل گئی اور پھر شام تک کوئی لمحہ اس کو شاداب نہ کر سکا تھا۔

دفتر میں کمپیوٹر کو شٹ ڈاؤن کرنے کے بعد لمحہ لمحہ مصروفیت کی نذر ہو جانے والے وجود کو مجتمع کرنا ایک کٹھن مرحلہ تھا، جیسے تیسے جوڑ توڑ کر خود کو خود میں ڈھال کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

دفتر کے خنک ماحول سے نکل کر باہر کی نم اور گھٹی گھٹی فضا میں دبے دبے شور میں گہری گہری سانس لینے لگا۔

سڑک پر خاموش چلتے ہوئے ہجوم، سگنل کی جلتی بجھتی روشنی، بجلی کے پول، اونچی عمارت، موبائل ٹاور سے ہوتی ہوئی اس کی نظر آسمان تک چلی گئی اور دوسرے ہی لمحے اسی ترتیب سے لوٹی تو اسے وہ نظر آ گئی۔

کبھی کبھی وقت اور حالات اعصاب کو اس حد تک شکستہ کر دیتے ہیں کہ سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت کہیں دفن ہو جاتی ہے اور وہ بے ارادہ کام کرنے لگتا ہے جو کبھی نہیں کیے ہوتے۔

اور وہ فرصت سے تھی یا عجلت میں، اس کی طرح تھکن زدہ تھی یا آسودۂ جاں، وہ الجھی ہوئی تھی کہ سلجھنے کی خواہش رکھتی تھی وہ ان سوالوں کو خود ہی رد کرتا اس کے سبک اور رواں قدم کے نقش پر بے سوچے سمجھے قدم رکھنے لگا۔

اس کے اجنبی چہرے پر بڑی ہی زندگی آمیز ملاحت تھی۔ کچھ لمحے دیکھتے رہنے کے بعد اسے لگا کہ مانوسیت کے ننھے ننھے چراغ جل اٹھے ہیں۔ وہ تیزی سے اجنبی ہوتی دنیا سے نکل کر مشکوک بھری فضا سے باہر آ کر کچھ لمحوں کو زندگی جینے کی حسرت کرنے لگا۔

کجلائی ہوئی شام بہت بے تابی سے جگمگاتی رات میں ڈھلنا چاہتی تھی، اور وہ دیکھ رہا تھا کہ شام کے سائے اپنے اصل وجودوں سے لمبے ہو رہے تھے اور وہی پھیلتے ہوئے سائے کچھ ہی دیر میں سمٹ کر گھٹ جانے والے تھے۔ ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالے، خود کو زندگی سے جوڑتے اس کے پیچھے چل دیا۔

وہ اس کی سوچ، اس کی خواہشوں، اس کے اندر امڈتی وحشت، سوال، جواب سے بے خبر اپنی ہی کائنات میں گم، مگن چل رہی تھی۔

''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

ابھی یہ خواہش اندر سے امنڈ کر لفظوں میں ڈھلی بھی نہیں تھی کہ وہ اس سے چند قدم آگے ہوئی تو ان دونوں کے درمیان ایک کائنات آ گئی۔ چمکتی دمکتی دوکانوں سے سجی یہ سڑک اور اس پر چمکتے دمکتے خریدار بے دریغ لمحوں کو خرچ کر کے اپنی صلاحیت اپنی قابلیت کے عوض کٹھن زندگی کو سہل کرنے کے نسخے خریدنے کی خوشی میں سرشار نظر آ رہے تھے۔ لمحہ بھر کو اوجھل ہو جانے والا چہرہ اسے بے چین کر گیا۔ کائنات خالی خالی لگنے لگی، وہ جو اچانک ہی اس کی خواہش سے جڑ گئی تھی، سو اس کی نظر نے اسے ہجوم سے الگ کیا اور وہ پھر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

بنی ٹھنی دوکانیں، خریدار کو ترغیبات میں الجھانے کو سراپا نمائش بنی ہوئی تھیں۔ سبز، سرخ، گلابی، کاسنی، قرمزی، رنگ کے ملبوسات بہار دکھلا رہے تھے۔ لڑکی کی سمندر آنکھوں میں بہان شوق ہلکورے لے رہا تھا اور یہی سارے رنگ اس کے اندر سے امڈ پڑے تھے، اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ ان رنگوں کی ہولی میں اس کو رنگ دے، اور وہ چھڑاتے چھڑاتے بے حال ہو جائے۔ مگر ابھی تو ''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے'' سے بات شروع کرنا تھی۔

پھر یہ باتیں وہاں ختم ہوتیں، جہاں کائنات، وہ ساری باتیں جو اس کے اندر اچانک ہی پھولوں کی صورت کھل اٹھی تھیں اور وہ ان کی مہکار سے اس کو بسا کر رکھ دینا چاہتا تھا۔

ان ہی لمحوں میں ہندسوں، اعداد، جمع، تفریق حاصل ضرب سے اکتائے ہوئے ذہن میں ڈھیر کی صورت پڑی ہوئی بیزاری خاک دھول مٹی ہو کر فضا میں بکھر چلی تھی۔ وہ اس لمحے ان چہروں کو بھول بیٹھا تھا۔ جو ترقی کی دوڑ میں نکل کر اس کے اندر کسک چھوڑ گئے اور جو پیچھے تھے ان سے خوف کھاتا الجھتا رہتا تھا کہ کب آگے نکل جائیں گے۔

دھیان، بے دھیانی میں اس کی سوچ کہاں کہاں چکراتی پھر رہی تھی۔ اور وہ لڑکی کے پیچھے، وارڈ روب، ماڈرن ہاؤس، پیٹر اینڈ براؤن، ہاتھ نگاری، کلیفورڈ، دی ٹیلر سے ہوتی ہوئی اب ''تھریڈز'' پر کھڑی تھی۔

نسبتاً یہاں سناٹا تھا۔ آؤٹ لیٹ سے آتی روشنیاں باہر تک آتے آتے تھک کر مدھم ہو رہی تھیں۔ اور اب

تک اس سے کچھ نہ کہہ سکنے کی تھکن اس سے لپٹنے لگی تھی۔

''سنیے'' یہاں اسے بس یہی کہنے کا موقع مل گیا۔

وہ ایک لمحہ کو اس کی سمت مڑی، اور بے تاثر نظروں سے اس کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون نکالا اور کانوں سے لگالیا۔ بات کرتے ہوئے ایک بار پھر چلنا شروع کر دیا۔

کچھ کہہ نہ پانے کی کسک سے اب اس کے اعصاب شکستہ ہو کر جارحانہ ہونے لگے تھے۔

ہاتھ بھر کی وہ ننھی سی مشین جو اس کے ہاتھ میں تھی، جس نے فرد کو فرد سے جوڑ سکنے کی اپنی سی سعی کر رکھی تھی کو چھین کر ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کو جی چاہا۔

اسی اثناء میں اس کا اپنا موبائل جیب میں تھرتھرانے لگا۔ اس نے اس کو اندر ہی اندر خاموش کر دیا کہ اس سے پہلے بھی کئی بار بات کرنے کی للک میں اپنے موبائل سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

نیم تاریکی میں، اس کے صبیح چہرے پر کسی کی گفتگو سے پھول کھل کر روشن ہو رہے تھے، اور اس کے نقوش کھلکھلا رہے تھے۔ وہ باغ و بہار بنی جا رہی تھی۔ ''خدا حافظ'' کی آواز اس نے سنی، اور یہ بھی دیکھا کہ وہ موبائل بیگ میں رکھتے رکھتے اس پر ایک نظر ڈال گئی ہے۔ وہ جلدی سے مستعد ہو کر ہونٹ پھیلا بیٹھا۔

لڑکی کے لبوں پر ہلکی سی ہنسی اُبھر کر ڈوب گئی۔

سبز بتی بجھی اور لال بتی جلی تو ٹریفک ایک دھچکے سے رک گیا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ سڑک کراس کرنے لگا۔

اب تھکن اس کے پیروں سے لپٹنے لگی تھی اور یہ بات اس کو توڑ رہی تھی کہ وہ کب سے اس کے ساتھ ساتھ ہے اور اب تک مانوسیت کا ایک ننھا سا دیا بھی اس کی آنکھ میں جھلملا نہ سکا۔ وہ ہنوز اس کے لیے اجنبی ہے۔ جب کہ وہ اتنی ہی دیر میں شناسائی سے مانوسیت اور مانوسیت سے اپنائیت کے رشتے میں مکمل ڈھل چلا تھا۔ اور بہت کچھ کہنے کا استحقاق اس کے لہجے میں خود بخود اتر آیا تھا۔

''سنیے'' وہ ایک لمحہ کو قریب ہو کر شائستہ اور مہذب لہجے میں کہہ اٹھا۔

وہ جو رک کر میوزک سٹی کے نئے آڈیو البمز کے پوسٹرز دیکھ رہی تھی، چونک کر مڑی، اجنبی حیران نظروں پر وہ پہلے تو ٹپٹایا اور پھر بوکھلا کر رہ گیا۔

اسی پل اس کے اندر سے ہمت امڈی کہ اگر وہ لمحہ گنوا بیٹھا تو پھر مانوس اجنبیوں میں گھر کر گم ہو جائے گا۔ ضرورت کے تعلق میں بندھے کا بندھا رہ جائے گا اور معمول کے پہیے میں گول گول گھومنے لگے گا۔

''وہ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں'' اس نے صاف صاف واضح الفاظ میں اپنا مدعا بیان کر ہی دیا۔ وہ ناسمجھی کی کیفیت میں اسے دیکھنے لگی اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر جھٹک دیا۔

اس نے ایسا تو کچھ پر پیچ، پر شکوہ، گنجل دار جملہ بھی تو نہ کہا تھا، جو سمجھ سکنے میں اسے دشواری ہوئی ہو، وہ اُلجھ سا گیا پھر ٹھہر کر دوبارہ بولا۔

''میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

توقع کے برخلاف یہ جملہ لمحہ بھر میں اس کے شاداب چہرے کو کملا گیا۔ وہ سر جھٹک کر بوکھلائی اور لڑکھڑا گئی۔ وہ اس کی لڑکھڑاہٹ کو سہارا دینے کو آگے بڑھا کہ وہ تیزی سے مڑ کر اپنے بیگ کو سینے سے دبوچے اسے مشکوک نظروں سے دیکھتے کترا کر نکلنے لگی۔

اس کا جی چاہا کہ وہ چیخ کر کہے کہ

''میں تم سے۔'' اس کا فقرہ ادھورا ہی رہ گیا۔ وہ چہرے پر وحشت لیے گھبراہٹ کے عالم میں تیزی سے نکلتی چلی گئی۔

اس کے اندر گھٹن اور حبس نے جیسے میخیں گاڑ دیں۔ وہ ساکت کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس کے اندر کا سناٹا وجود کا حبس، کچھ کہنے کی حسرت اس لڑکی سے لپٹی دور تک چلی گئی۔

یہاں تک کہ اس کا وجود سائے میں ڈھلا اور پھر معدوم ہوتا چلا گیا۔

وہ نیم تاریکی سے نکل کر اس اجنبی مگر روشنیوں سے جگمگاتی دنیا میں لوٹ آیا۔

اور کچھ دیر پہلے سرزد ہونے والی اپنی حماقت کے بارے میں سوچتے ہوئے ہنس دیا۔ پھر واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔ تیز روشنیوں نے دور تک اسے دیکھا، یہاں تک کہ اس کا وجود سایے میں بدلتے ہوئے معدوم ہوتا چلا گیا۔

❁❁

Address:
I-606 Rufi Green City
Block 18, Gulistan-e- Jauhar
Karachi : 75290
Ph # 021-4631495

غزل

سیّد امین اشرف

وہ فلک سیر و فلک بیں مہِ خوش رو نکلا
پھر سر شام تری یاد کا پہلو نکلا

ہم تو اس عشق میں سرشار رہا کرتے ہیں
آہ نکلی نہ کبھی آنکھ سے آنسو نکلا

میں ہوں آوارگیٔ حلقۂ تنہائی ہے
آنکھ میں درد چھپائے ہوئے کیوں تو نکلا

جیسے تبدیلیٔ موسم کی ادا ہو یہ بھی
چاند کو چھت پہ نکلنا تھا لبِ جو نکلا

شہر میں جوہرِ شمشیر کا چرچا تھا بہت
آکے دیکھا تو ہلالِ خمِ ابرو نکلا

ہے کہاں زاویۂ ظاہر و باطن یکساں
جس کو سمجھے تھے خطا پوش، خطا جو نکلا

ہم تو چلاتے رہے دور سے دریا دریا
وہی دریائے سبک، سر بہر سو نکلا

خانقاہیں کششِ سجدہ سے خالی خالی
مکتبِ فکر گرفتارِ من و تو نکلا

❁❁

غزل

سیّد امین اشرف

پیچ در پیچ سوالات میں اُلجھے ہوئے ہیں
ہم عجب صورتِ حالات میں اُلجھے ہوئے ہیں

ختم ہونے کا نہیں معرکۂ عشق و ہوس
مسئلے سارے مفادات میں اُلجھے ہوئے ہیں

کس خسارے میں نظر ہے کہ سمٹ جاتی ہے
کچھ ابھی دائرۂ ذات میں اُلجھے ہوئے ہیں

ان میں تو مجھ سے زیادہ ہے پریشاں نظری
آئینے شہرِ کمالات میں اُلجھے ہوئے ہیں

اس پہ دعویٰ بھی کہ یہ کارِ مسیحائی ہے
سارے اذہان خرافات میں اُلجھے ہوئے ہیں

کرۂ خاک پہ پڑتے ہی نہیں ان کے قدم
دیدہ ور سیرِ طلسمات میں اُلجھے ہوئے ہیں

نورِ مطلق کی ہے تشبیہ نہ تمثیل مگر
ہم اشارات و کنایات میں اُلجھے ہوئے ہیں

❁❁

Address:
4/54 Badar Bagh, Civil Lines
ALIGARH : 202002
(U.P.) India

غزل

صادق مدہوش

سب سے عظیم شے ہے صداقت لکھو لکھو
سب سے بڑی ہے حرف کی طاقت لکھو لکھو
گزرو کبھی تو وادیٔ وہم و گمان سے
ہاں ساکنانِ حجلۂ عزلت لکھو لکھو
ہاں پھر سے شرحِ رمز فسانہ رقم کرو
ہاں پھر سے کوئی تازہ حکایت لکھو لکھو
دارو رسن صلہ ہے وفا کا کہو کہو
کیسا خلوص، کیسی مروّت، لکھو لکھو
ہر سمت ہے فضاؤں میں اک شور الاماں
جو دیکھتی ہے چشم بصیرت لکھو لکھو
مٹنے کو ہے ہر ایک حقیقت جہان سے
لٹنے کو ہے یہ بزم کی زینت لکھو لکھو
چھننے کو ہے یہ عمر کی دولت سنو سنو
اٹھنے کو ہے یہ وقت کی میّت لکھو لکھو
رخصت ہے دل سے رنج فراق و وصال کی
لگتی نہیں کہیں بھی طبیعت لکھو لکھو
ہاں جو بھی لمحہ گزرے غنیمت سے اسے کہو
ہاں جو بھی سانس آتی ہے نعمت لکھو لکھو

❀❀

غزل

صادق مدہوش

حدیثِ جاں حدیث دیگراں ٹھہری تو کیا ہوگا
جہاں کی داستاں یہ داستاں ٹھہری تو کیا ہوگا
دلِ ناداں تری باتوں میں آ کر ہم چلے تو ہیں
اگر محفل میں شرط نقد جاں ٹھہری تو کیا ہوگا
وہ ہی اک بات جس پر مدتوں ان سے رہی رنجش
وہ ہی اک بات پھر سے درمیاں ٹھہری تو کیا ہوگا
گزرتی ہے ابھی تک تو اسی اُمید پر لیکن
یہ کوشش بھی جو سعی رائیگاں ٹھہری تو کیا ہوگا
کوئی بتلائے پھر جینے کی صورت کون سی ہوگی
صبا اس بار بھی اک پل یہاں ٹھہری تو کیا ہوگا
وہ ہی جس کے لیے اب تو ہمیں سب کچھ گوارا ہے
بلائے جاں وہ ہی آرام جاں ٹھہری تو کیا ہوگا

❀❀

Address:
123 Block B,
Sindhi Muslim Housing Society
Karachi.
Ph # 4528926

غزل

شاہین

اب فیصلے کے بعد صعوبت ہی کتنی ہے
اک جاں ہے بیچ اور مسافت ہی کتنی ہے
سود و زیاں کا ذکر ہی کیا حسن و عشق میں
دونوں کے درمیان تجارت ہی کتنی ہے
آنکھوں میں سو جہان ہیں آب و سراب کے
باقی، بچی کھچی سی یہ حیرت ہی کتنی ہے
جو چاہے دل کو بول لگا کر خرید لے
دو چار بوند خون کی قیمت ہی کتنی ہے
دورانِ رقص ہو کی اجازت بس اور کیا
درویشِ دل زدہ کی شریعت ہی کتنی ہے
ہم بے نیاز جیتے ہیں اپنے گمان میں
ممکن کچھ اس حصار میں وحشت ہی کتنی ہے
اڑتا ہے تیر بن کے ہوا میں خزاں کے بعد
اک دق زدہ پرند کی ہجرت ہی کتنی ہے
سیال وہ کہ جس سے معیشت ہے برق گام
سو آدمی کے خون کی قیمت ہی کتنی ہے
بس گرد پوش پر ہے توجہ تمام تر
اوراقِ درمیاں کی ضرورت ہی کتنی ہے
اس طرح عمر بھر جو رہا چارہ گر کا ساتھ
شاہین اب مریض کو مہلت ہی کتنی ہے

❁❁

غزل

شاہین

ان گھروں کے اندر کی بے گھری تو میری ہے
میں جہاں ہوں جیسا ہوں زندگی تو میری ہے
آگ سر اُٹھاتے ہی مل گئی ہے مٹی میں
لاکھ ہو گماں شاطر آگہی تو میری ہے
چاند ہو فلک پر کایا دیا بجھے گھر کا
رات سے شکایت کیا روشنی تو میری ہے
کیا خبر کہاں جاکر ساتھ چھوڑ دے میرا
خاک کا بھروسا کیا خاک بھی تو میری ہے
شہرِ آرزو کا یہ منطقہ ہے زیبا تر
ہے کہیں اگر اس میں کچھ کمی تو میری ہے
تیری ان بہاروں کو ورنہ پوچھتا ہی کون
رنگ سب سہی تیرے، تازگی تو میری ہے

❁❁

Address:
1328 Potter Drive
Manotiok Ontario
K4M 106, (Canada)

غزل

غلام حسین ساجد

بس اتنا یاد ہے جب سانس لینے کو رکے تھے
کہانی کے سبھی کردار بوڑھے ہو چکے تھے
یونہی آتی رہی دنیا ہمارے راستے میں
ہم اس کے چاہنے والے کہاں تھے؟ آپ کے تھے!
دلوں پر بوجھ تھا حرفِ ندامت کے سوا بھی
جو داغ اس نے دیا تھا ہم اسے کب دھو سکے تھے!
نہ کام آئے گرفتِ پنجہ اعدا میں آکر
کسی کو یاد ہنس دینے کے جتنے ٹوٹکے تھے
میں گہری نیند میں کھو کر بھی اتنا جانتا ہوں
لبِ لعلیں کسی کے میرے ہونٹوں پر جھکے تھے
اعادہ کر رہے تھے اپنی اپنی عادتوں کا
کہ ہم بیدار تھے اور سونے والے سو رہے تھے
کبھی آتے رہے میرے مقابل میں جو ساجدؔ
مجھ ہی سے لاابالی تھے، مجھ ہی سے بے تکے تھے

❁❁

Address:
280 Raza Block
Allama Iqbal Town
Lahore : 54570 (Pakistan)

غزل

غلام حسین ساجد

کوئی دیوار گری ہے مرے اندر شاید
ہوگا اب حال مرا اور بھی ابتر شاید
تیرگی جھڑنے لگی ہے دل آزردہ سے
دھوپ آنے لگی سایے کے برابر شاید
خواب میں دیکھ رہا ہوں تجھے آتے جاتے
نیند آئی تھی ترے دھیان سے چھپ کر شاید
دشت میں آ کے خیال آیا ہے اپنے گھر کا
اس سے پہلے وہیں دیکھا تھا یہ منظر شاید
جس نے بے دخل کیا ہے مجھے اپنے دل سے
وہ بھی خوش رہ نہ سکے گی مجھے کھو کر شاید
اوڑھ رکھی تھی تری یاد کی چادر میں نے
مہرباں مجھ پہ نہیں تھا مرا بستر شاید
دن نکلتا ہے تو بڑھتی ہے سیاہی شب کی
شہر ہو آپ کے آنے سے منوّر شاید
کوئی خود سا بھی دکھائی نہیں دیتا ساجدؔ
میرا ہم زاد مگر مجھ سے ہو بہتر شاید

❁❁

غزل

صابر ظفر

جنگل کے سونے پن میں جو میں ایک پل گیا
وہ رقص مور نے کیا، منظر بدل گیا
باغِ بہشت میں بھی نہ تھا وہ گلِ مراد
کوئل کے کوکنے سے مگر دل بہل گیا
پنجرے کا در کھلا تو کھلا زندگی کا در
ایسا لگا کہ سوکھا پرندہ مچل گیا
میں چھو نہ پایا نور فشاں طائرِ ازل
لیکن مجھے لگا کوئی جادو سا چل گیا
جلتے پرندے خواب میں دیکھے گئے ظفرؔ
تعبیر ڈھونڈتے ہوئے میں خود بھی جل گیا

❁❁

غزل

صابر ظفر

چکور چاند میں گم، پھول میں ہے خوشبو گم
میں کس ہوا میں ہوں، مجھ میں نہیں اگر تو گم
جہاں چھلکتا ہے گندم کی بالیوں کا شباب
ہوئے ہیں ایسی ہی فصلوں میں دو پکھیرو گم
ہوائے ہجر میں پنچھی کی پھڑ پھڑاہٹ سے
بجھے ہیں اشک فروزاں، ہوئے ہیں جگنو گم
لبھائے کیا مرا دل، خاک و آب کی دنیا
غزال دشت میں، مرغابیاں لبِ جو گم
ظفرؔ نہ کس لیے آبی پرندے بین کریں
مچھیرے گم ہیں، سفینے بھی گم ہیں چپو گم

❁❁

Address:
Publication Sector
Information Govt. of Sindh, 4B
Seectt. Karachi.
Ph # 9202610, 6360642

غزل

کرشن کمار طورؔ

دیوار ہی جب سایۂ دیوار میں آئے
تو سرخی کہاں نرگس بیمار میں آئے

خود جان کے بھی کوچۂ قاتل سے ہیں گزرے
دانستہ بھی ہم حلقۂ اغیار میں آئے

جب جنس گراں مایہ کا گاہک ہی نہیں تھا
ہم لوگ بھی کب گردش بازار میں آئے

سرسبز پھر اب ہونے لگی عشق کی دنیا
پھر لوگ کسی آنکھ کے اسرار میں آئے

کچھ دیر سے روشن ہوئی اک برق تجلی
کچھ دیر سے ہم اس نگہۂ یار میں آئے

اک لمحہ میں بس قفل لگا دل پہ ہمارے
اک لمحہ میں ہم نرغۂ اغیار میں آئے

ہے یہ تو خبر ختم پہ ہے دشت ہوس طورؔ
تیزی بھی تو اب اس مری رفتار میں آئے

❁❁

Address:
134/E, Khanyara Road
Dharamshala : 176215
HP - (India)

غزل

کرشن کمار طورؔ

یہ زخم کس کو دکھاؤں خدا کے ہوتے ہوئے
کوئی صدا نہیں زنجیر پا کے ہوتے ہوئے

مرے ضمیر کی مجھ پر ہے آنکھ ہر لمحہ
میں پھر رہا ہوں برہنہ قبا کے ہوتے ہوئے

یہ بات دیکھیں تو لگتی ہے غیر معمولی
غبار چھایا ہوا ہے ہوا کے ہوتے ہوئے

یہی تو دیکھنا تھا کھولتا اگر تو کیا
یہاں پہ میں ترے بند قبا کے ہوتے ہوئے

میں اپنے آپ کو کرتا یہاں نظر انداز
تھی کیا مجال لبوں پر صدا کے ہوتے ہوئے

ہے دہر ویسے بھی۔ بے فیض۔ باوجود لطف
نہیں ذرا سا اثر بھی دوا کے ہوتے ہوئے

یہ بات کس سے کہیں اور کسے سنائیں طورؔ
کہ اپنی جھولی ہے خالی دُعا کے ہوتے ہوئے

❁❁

غزل

یعقوب راہی

موسم ابر ہے نہ بارش ہے — فصلِ گل کی عجیب خواہش ہے
زندگی اور اس قدر بے کیف — کوئی چاہت نہ کوئی رنجش ہے
کوئی کب تک سنبھل سنبھل کے چلے — راستہ راستہ تو لغزش ہے
راکھ کا ڈھیر ہے کہ ٹوٹے دل — کوئی دھڑکن نہ کوئی شورش ہے
خوف و دہشت کے اس خرابے میں — صبر بے بس کی آزمائش ہے

غزل

موج در موج بپا شورش طوفاں کا سفر — جیسے رگ رگ میں کسی سوزش پنہاں کا سفر
یہ الگ بات کہ مصروف رہا کرتے ہیں — راس آتا ہے کسے دشت بہاراں کا سفر
کھیت، کھلیان، دھنک، چاند، ستارہ، چہرے — خواب در خواب عجب حسن ہزاراں کا سفر
چین کی سانس کہاں کس کو میسر آئی — ختم ہوتا ہی نہیں منزل امکاں کا سفر

غزل

دن بھر کی اس اڑان کا انجام، تو بھی دیکھ — اے صبح اعتبار مری شام، تو بھی دیکھ
سارا نشہ تو بس تری آنکھوں کی دین تھا — کتنے ہیں بے اثر یہ بھرے جام، تو بھی دیکھ
پھر تیری یاد، تیرا تصوّر، ترا خیال — پھر چشم نم میں نت نئے کہرام، تو بھی دیکھ
تیرے ہی انتظار میں روشن سبھی چراغ — پھر بجھ رہے ہیں آج سرِشام، تو بھی دیکھ
تیرے بغیر کیسے گزرتی ہے زندگی — آکر کبھی نوازش و اکرام، تو بھی دیکھ

Address:
(101 Arpan Apartment Luxmi Park, Nayanagar, Meera Road
Mumbai : 401 107 Ph : 28116915 M = 9820381737)

غزل

صابر عظیم آبادی

روش اپنی بدلنا چاہتا ہوں
تری آنکھوں میں چلنا چاہتا ہوں
حصار ذات سے باہر نکل کر
نئے سانچے میں ڈھلنا چاہتا ہوں
گلابی رت کا منظر ہے جب ہی تو
تری خوشبو میں جلنا چاہتا ہوں
مجھے صحرا نوردی سے نہ روکو
میں کانٹوں سے نکلنا چاہتا ہوں
بلندی سے گرا ہوں اس لیے میں
ہر ایک لمحہ سنبھلنا چاہتا ہوں
میں ایسا پیڑ ہوں جو سب کی خاطر
ہر اک موسم میں پھلنا چاہتا ہوں
نکل کر میں حصار غم سے صابرؔ
فضا گھر کی بدلنا چاہتا ہوں

❁❁

غزل

صابر عظیم آبادی

چراغ جل نہ سکا ہم نے گو جلایا بہت
ستارا کوئی نہ تھا رات نے رلایا بہت
ہم ہی نے بند دریچے کو عاقبت جانا
ہوا نے ورنہ دریچے کو کھٹکھٹایا بہت
عجیب نیند تھی سوئے تو پھر اُٹھے ہی نہیں
نہ جانے کون سی لوری نے تھپتھپایا بہت
بہت ملول تھا دل اس لیے گھر ہی میں رہے
وگرنہ رات گئے چاند نے بلایا بہت
جزیرے نیند کے آواز دے کے سو بھی گئے
کسی سلگتی ہوئی یاد نے جگایا بہت
فصیلِ جسم نے رکھا تھا آڑ میں لیکن
دیا تھا دل کا ہواؤں میں جھلملایا بہت
شفق کے رنگ تھے اور سرد سی ہوا تھی عظیم
تو شام کا جھومر تھا جگمگایا بہت

❁❁

غزل

حسیر نوری

خواب کی دلکش حسیں وادی میں آ بیٹھا ہوں میں
یہ نہ سمجھو اس جہاں سے بے خبر رہتا ہوں میں
چاہتا ہوں بدل ڈالوں میں خود ہی راستہ
چلتے چلتے پھر اچانک رک کے رہ جاتا ہوں میں
رنجشیں اپنی جگہ پھر بھی وہ میرا دوست ہے
جب بھی ملتا ہے، گلے مل کر بہت روتا ہوں میں
پیاس کو میری بجھائے، کوئی ایسا بھی تو ہو
سامنے دریا کے بیٹھا ہوں مگر پیاسا ہوں میں
دشتِ غربت کے سفر میں در بدر پھرتا رہا
دھوپ نکلی تو ترے سائے میں آ بیٹھا ہوں میں
شکل پہچانی نہیں جاتی مری، میں کیا کروں
زندگی تجھ کو بہت اچھی طرح سمجھا ہوں میں
ایسا لگتا ہے کہ مجھ میں کچھ کمی ہے اے حسیؔر
ورنہ اپنی ذات کے سائے میں کیوں رہتا ہوں میں

❁❁

غزل

حسیر نوری

رکھے ہوئے تھے راہ میں پتھر حدود کے
میں نے مٹائے فرق قیام و سجود کے
میری جھکی جبین کو چومے ہے آ کے عرش
دیکھے کوئی تو فرش پہ منظر حدود کے
اک آئینہ ہی ٹوٹ کے پھر چور ہوگیا
بکھرے ہوئے ہیں رنگ ہزاروں شہود کے
صحرا کے حبس میں یہ چلی کیا ہوا کہ اب
کھلنے لگے ہیں دیکھ دریچے وجود کے
پہلے تو اپنے دل کے اندھیروں میں دے اذاں
ورنہ سحابؔ تیرے ہیں سجدے نمود کے

❁❁

Address:
234-W, Scheme No.3
Farid Town
SAHIWAL (Punjab) Pakistan

غزل

مرغوب علی

دن گزر جاتا ہے پر رات سے جی ڈرتا ہے
چھت شکستہ ہو تو برسات سے جی ڈرتا ہے
پھول شاخوں پہ بھی مرجھا کے بکھر جاتے ہیں
تو ہو گر ساتھ ترے ساتھ سے جی ڈرتا ہے
آبگینے میں تعلق کے نہ بال آئے کہیں
بات کرتے ہوئے ہر بات سے جی ڈرتا ہے
چاندنی راتیں نہ آئیں یہ دعا کرتا ہوں
اب تو گزرے ہوئے لمحات سے جی ڈرتا ہے
پھر تمازت ترے پہلو کی جگا دیتی ہے
نیند میں بھی تری اس گھات سے جی ڈرتا ہے

❀❀

Address:
49 Dharm Daas
Najeb Abad : 246763
(U.P.) India

غزل

مرغوب علی

اکیلے، اکیلے سدا ڈھونڈتا ہے
یہ ہر شب بھلا چاند کیا ڈھونڈتا ہے
نمی تیر جاتی ہے آنکھوں میں اس کی
دعاؤں کا جب بھی صلہ ڈھونڈتا ہے
گئی عمر کی بند گلیوں میں انساں
سزا ڈھونڈتا ہے جزا ڈھونڈتا ہے
لبوں سے بچھڑ کہ جو بے آسرا ہے
وہ اک حرف صوت و صدا ڈھونڈتا ہے
میں موجوں کے رخ پر اگا زرد منظر
تو کشتی جسے نا خدا ڈھونڈتا ہے

❀❀

غزل

سلیم انصاری

(۱)

ترے خیال میں جو اپنی شام کاٹتا ہے
اسے طلوع مہ نا تمام کاٹتا ہے

پرندے لوٹ کے جب گھونسلوں میں آتے نہیں
گھنے درخت کو آسیب شام کاٹتا ہے

غنیم شہر مرا کس قدر مہذب ہے
وہ گردنیں بھی بعد احترام کاٹتا ہے

بہت شدید ہے اس کو شکست کا احساس
جو خود ہی تیغ سے اپنی نیام کاٹتا ہے

ہے جس کے پاس مری فکر میرے لفظ سلیم
اسی کو اب مرا طرزِ کلام کاٹتا ہے

(۲)

ہے جو ماتھے پہ نور مٹی کا
سب کرم ہے حضور مٹی کا

معتبر کردے میری دربدری
ٹوٹ جائے غرور مٹی کا

تو جو اتنا بدل گیا اس بار
فرق ہے کچھ ضرور مٹی کا

ہوگیا ہے لہولہان بدن
آج پھر بے قصور مٹی کا

میرے لہجے کی تلخیوں میں سلیم
زہر ہے ناصبور مٹی کا

Address:
LIG-11 New Anand Nagar, Colony
Adhartal, Jabalpur (M.P.) India

(۳)

میری روشن جبین مٹی سے
میرا سارا یقین مٹی سے

سانپ نا معتبر ہوئے سارے
جڑ گئی آستین مٹی سے

روند آئے ہیں کوہساروں کو
ڈر رہے ہیں مہین مٹی سے

اب کے رشتہ ہی کٹ گیا میرا
آنسوؤں کی امین مٹی سے

میری تشکیل ہو رہی ہے سلیم
درد کی بہترین مٹی سے

(۴)

نمو جذبات سے سرشار مٹی
بناتی ہے مجھے شہکار مٹی

یہ کس کے لمس کی جادو گری ہے
بدن میں ہوگئی بیدار مٹی

میں اندر سے بکھرنا چاہتا تھا
سو مجھ کو کر گئی مسمار مٹی

میں کٹ جاتا ہوں جب اپنی جڑوں سے
بلاتی ہے سمندر پار مٹی

جنوں کے خواب دکھلانے لگی ہے
مرے اندر کی دنیا دار مٹی

❁❁

Address:
LIG-11 New Anand Nagar
Colony, Adhartal
Jabalpur (M.P.) India

غزل

اقبال فریدی

دھڑکنے دل کی صدا آگئی ہمارے کام
شروع ہی سے دھڑکتا رہا ہے خوش انجام

کھڑے تھے ہم بھی صفِ چاکراں میں برہم سے
کہا کہ جاؤ چلے جاؤ تم سے کچھ نہیں کام

کہا کہ ہم کو گوارا ہے مفت مزدوری
تو مسکرا کے کہا کافی ہیں میرے خدام

لپک کے چوم لیا میں نے نقش لب بہ سبو
پتہ نہیں تمہیں کیسا لگا مرا اقدام

شب سیاہ جوانی بھی، تم سے تھی منسوب
سپیدۂ سحری بھی ہوا تمہارے نام

فریدؔی وصل تو اک کیفیت ہے جس کے لیے
ضروری تو نہیں پہلو میں ہو وہ خوش انجام

❁❁

Address:
Station Director
Radio Pakistan
Karachi

غزل

اجمل سراج

دل سے دُنیا کا ڈر نکل گیا ہے
دل عجب راہ پر نکل گیا ہے

وہ نہ جانے کہاں سے آیا تھا
اور نہ جانے کدھر نکل گیا ہے!

اب تو یہ دل ہے اور تیری یاد
بس کہ خوف و خطر نکل گیا ہے

اس دماغ خراب و خستہ سے
سب غرور ہنر نکل گیا ہے

پاؤں سے رہ گزر نکل گئی ہے
ہاتھ سے ہم سفر نکل گیا ہے

❁❁

Address:
B-97 Sector A/35
Korangi # 6
Karachi
Cell # 0321-2150963

غزل

شاہدہ حسن

ہوس پرستوں کی زندگی میں ملال کے راستے بہت ہیں
کمال کے پیچ وخم سے آگے زوال کے راستے بہت ہیں
بس ایک حیرت کدہ ہے دنیا اسے سمجھ کر بھی میں نہ سمجھی
یہاں جوابوں کی جستجو میں سوال کے راستے بہت ہیں
تری ذہانت سے آملی ہے مری ذہانت کو کوئی صنوی
رفاقت جسم و جاں سلامت وصال کے راستے بہت ہیں
میں دھیان کی رہ گزر پہ تجھ سے کسی بھی منظر میں آملوں گی
اگر کوئی یاد آرہا ہو خیال کے راستے بہت ہیں
ہوا کی سازش کا سامنا تھا تو دل کی لو کو بڑھا لیا ہے
سیاہ ظلمت سے زندگی بھر جدال کے راستے بہت ہیں
نہیں کہ انجام زندگی سے میں بے خبر رہ کے جی رہی ہوں
سفر میں ختم سفر سے پہلے مآل کے راستے بہت ہیں

❁❁

Address:
J-308, Rufi Lake Drive
Block 18, Gulistan-e-Jauhar
Karachi : 75290

غزل

فاطمہ حسن

آنکھوں میں نہ زلفوں میں نہ رخسار میں دیکھیں
مجھ کو مری دانش مرے افکار میں دیکھیں
ملبوس بدن دیکھے ہیں رنگین قبا میں
اب پیرہنِ ذات کو اظہار میں دیکھیں
پوری نہ ادھوری ہوں نہ کمتر ہوں نہ برتر
انسان ہوں انسان کے معیار میں دیکھیں
رکھے ہیں قدم میں نے بھی تاروں کی زمیں پر
پیچھے ہوں کہاں آپ سے رفتار میں دیکھیں
منسوب ہیں انسان سے جتنے بھی فضائل
اپنے ہی نہیں میرے بھی اطوار میں دیکھیں
کب چاہا کہ سامانِ تجارت ہمیں سمجھیں
لائے تھے ہمیں آپ ہی بازار میں دیکھیں
اس قادر مطلق نے بنایا ہے ہمیں بھی
تعمیر کی خوبی اسی معمار میں دیکھیں

❁❁

Address:
Director Public Relations Sessi,
Karachi : 75300

غزل

عامر سہیل

بدن نشیب میں رکھا گیا صلیب پہ خواب
اگرچہ پاؤں میں ڈھیروں پڑے ہوئے ہیں گلاب
ہزار کوس سے ملنے دو ہونٹ آئے ہیں
لہو میں درد بہاؤں کہ پیرہن پہ شراب
مری سزا، میرا ہونا ہے، بے ضرر ہونا
چکا رہا ہوں میں پرکھوں کی بزدلی کا حساب
ہے میرے شہر پہ بے اجر محنتوں کا نزول
مرا غزل سے تکلم ہے، نعمتوں سے حجاب
پیمبروں کی طرح ہے یہ شہر بھی عامر
جو اپنے تن پہ رعونت کے سہہ رہا ہے عذاب

❁❁

Address:
220 Mahajir Colony
BAHAWALNAGAR
(Punjab)

غزل

تسنیم عابدی

عمر کی پونجی لگ جانے پہ پھر یہ سودا ہوتا ہے
اپنے آپ سے باہر آ کر خود سے ملنا ہوتا ہے

تشنہ لبی نے بنجر نظروں سے یہ اکثر پوچھا ہے
کیا جو پیاس بجھا نہ پائے وہ بھی دریا ہوتا ہے

خود غرضی ہتھیار تو ڈالوا دیتی ہے لیکن اکثر
خلوتِ جاں میں ایک مقدمہ خود سے لڑنا ہوتا ہے

جب میثاق ہوا اس لمحے ہم دونوں ہی راضی تھے
اب معلوم ہوا کہ ریشم کتنا کچا ہوتا ہے

کمرے سے دروازے تک کا فاصلہ چاہے کتنا ہو
دستک کی آواز پہ دروازے کو کھلنا ہوتا ہے

❁❁

Address:
Post Box # 2035, Abu Dhabi
(U.A.E.)

غزل

تسنیم عابدی

ہمیں جو کچھ دکھایا جا رہا ہے
پسِ پردہ تماشا دوسرا ہے

بہت انصاف کا چرچا ہوا تھا
مگر سب ظلم ہی کا معاملہ ہے

مجھے محدود کردے دائرے میں
مرا مرکز سے رشتہ ٹوٹتا ہے

صدائیں کھوگئیں ساری فضا میں
مرا خاموش لہجہ بولتا ہے

زوال آمادہ ہے گھر کا ادارہ
یہی تہذیب کا کیا ارتقا ہے

دکانِ دل بڑھا دی جائے کیونکہ
یہاں بے دام سودا ہوگیا ہے

مکمل ہی نہیں میری اکائی
جدھر دیکھو مرا حصہ بٹا ہے

مجھے میلے سے آخر کیا ملے گا
مرے جب گھر کا رستہ کھوگیا ہے

❁❁

غزل

حسن عباس رضا

مستقل اک زیاں میں رہنا ہے
جب تک اس خاک داں میں رہنا ہے
شہر نامہرباں کے ہیں ہم لوگ
ہم کو اپنی اماں میں رہنا ہے
ہم ازل کے جنوں پرستوں کو
کوچۂ قاتلاں میں رہنا ہے
ہم کو کچھ دوستوں کے ہوتے ہوئے
قریۂ دشمناں میں رہنا ہے
تم نے منہا کیا ہے مجھ سے مجھے
کیا مرے جسم و جاں میں رہنا ہے؟
کس لیے سر کھپائیں حال پہ ہم
جب ہمیں رفتگاں میں رہنا ہے
داستاں گو کو ہے خبر، کہ ہمیں
کب تک اس داستاں میں رہنا ہے

❁❁

Address:
80-06 30th Avenue
East Elmhurst
New York, NY-11370

غزل

فہیم جاوید

اپنے بازو بیٹھا ہوں
پھر بھی کتنا تنہا ہوں
بنتا اور، بگڑتا ہوں
میں دنیا کا نقشہ ہوں
ٹیڑھے میڑھے رستوں پر
سیدھا سیدھا چلتا ہوں
اوس کے ننھے ننھے قطرے
پلکوں سے چن لیتا ہوں
سچے لوگوں کے حق میں
پھولوں کا گلدستہ ہوں
خود سے ملنا چھوڑ دیا
اب لوگوں سے ملتا ہوں
دکھ سکھ جس میں رہتے ہیں
میں ایسا اک کمرا ہوں
جذبوں کے بازاروں میں
اپنے ہاتھوں بکتا ہوں
دریا کی لہروں پہ بہتا
ہلکا پھلکا، تنکا ہوں

❁❁

Address:
Post Box # 11421
Al-Riyadh : 833 (K.S.A.)

غزل

سحر علی

جو میرے اشکوں کو چنتا تھا موتیوں کی طرح
وہ ہنس کے توڑ گیا مجھ کو چوڑیوں کی طرح

گھٹن میں سانس بھی لینا محال ٹھہرا ہے
کبھی کھلے تو کوئی مجھ پہ کھڑکیوں کی طرح

کہیں فرار کی منزل نہ کوئی راہ فرار
وفا کا کھیل بھی ہے سانپ سیڑھیوں کی طرح

یہ کون ہے جو مری چھت پہ چاند راتوں کو
پکارتا ہے مرا نام پاگلوں کی طرح

مرے تو خاص ہوئے اس کی زندگی میں سحر
مجھے سمجھتا تھا وہ عام لڑکیوں کی طرح

❀❀

Address:
R-166, 15 A3
Buffer Zone
North Karachi.

غزل

کاوش عباسی

شرارِ دل کو تا چشم آنے کی مہلت نہیں ملتی
میں رونا چاہتا ہوں رونے کی فرصت نہیں ملتی

مری ان سوختہ تنہائیوں میں کتنے سورج تھے
چمکتی خلوتوں میں بھی وہ کیفیت نہیں ملتی

محبت، سرخوشی، تسکیں، تجھے بھی اچھے لگتے ہیں
پر ان روشن سیاروں سے میری قسمت نہیں ملتی

میں خوش ہوں، سیر ہوں، پھر بھی سدا بے کل سا رہتا ہوں
نہ جانے میرے دل کو کون سی اُلفت نہیں ملتی

عنایت خاص ہے فطرت کی ہم شعلہ مزاجوں پر
یونہی ہر لب کو تو اظہار کی قوت نہیں ملتی

تمام آسائشیں، سب عیش جاں ہیں رائیگاں کاوش
کسی پہلو دل مجروح کو راحت نہیں ملتی

❀❀

Address:
312 Mehran Apartment
Plot 12 STI, Bath Island
Clifton, Karachi.

غزل

حیدر وارثی

بے خوف جو گزرا ہے پُر پیچ بھنور سے وہ
مسرور بہت لوٹا دشوار سفر سے وہ
منزل پہ نہیں پہنچا رستے میں کہیں گم ہے
واپس تو نہیں آیا پیچیدہ ڈگر سے وہ
ساون کی عنایت سے محروم رہا آخر
لپٹا ہی رہا برسوں اک سوکھے شجر سے وہ
تسلیم کیا آخر اس نے مری قامت کو
تکتا تھا مجھے اب تک کوتاہ نظر سے وہ
اس موہنی مورت کے جادو میں ہوا گم سم
کیوں دیکھتا ہے حیدرؔ مبہوت نظر سے وہ

❁❁

Address:
Warsi Cottage
Taleem nagare
Bibipakar
DARBHANGA (Bihar) India

غزل

رب نواز مائل

تماشا جو بھی اپنے پیار سے ہو
بہر چہرہ، بڑے کردار سے ہو
کچھ ایسا گم کہ جانے کب سے، ہوں میں
مجازاً بھی نہ سب اسرار سے ہو
فلک سے پھول برسیں یا نہ برسیں
طلب تو پختہ ذکر یار سے ہو
یہ جیسی میٹھی باتیں، تم کرو ہو
یہ کس مکتب کے کن آثار سے ہو
مگر دیکھیں اسے ایسے کہ ویسے
خوشی مائلؔ کمالِ کار سے ہو

❁❁

Address:
Kucha Qadir Shaheed
Faqir Muhammad Road
QUETTA
(Baluchistan) Pakistan

غزل

قیوم واثق

نئی آتش لگائی جا چکی تھی
روّیوں سے بھلائی جا چکی تھی

نہ تھا اک داغ بھی دامن پہ میرے
سزا پھر بھی سنائی جا چکی تھی

اگرچہ میں پلٹ آیا تھا در سے
وہاں بیٹھک سجائی جا چکی تھی

ہوئی تاخیر سے آمد ہماری
غزل وہ گنگنائی جا چکی تھی

صعوبت کاٹ کر واپس جو پہنچے
وہ قربانی بھلائی جا چکی تھی

بدر کرنا تھا مجھ کو شہرِ دل سے
سو پنچایت بلائی جا چکی تھی

پتہ قاتل کا اب کیسے لگاتے
شہادت سب مٹائی جا چکی تھی

کنیزِ وقت کو ٹھکرا دیا جب
مرے قدموں میں لائی جا چکی تھی

گئے جب کوچۂ جاناں میں واثق
فصیلِ شب اُٹھائی جا چکی تھی

نوٹ: محترمہ بے نظیر بھٹو کے حوالے سے دوسری تخلیق
(ادارہ)

Address:
Post Box # 5648, Jeddah : 214032
(K.S.A.)

غزل

عادل حیات

تربتوں کی سرحدوں پر رسمیہ لکھا ہوا
فاصلوں کے رنگ میں ہے تصفیہ لکھا ہوا

آرزوؤں کی چتائیں ہر طرف رکھی ہوئیں
اور درو دیوار پر ہے تخلیہ لکھا ہوا

دل کی تختی سے مٹا ڈالے گئے سارے حروف
ایک جملہ رہ گیا ہے عشقیہ لکھا ہوا

زندگی دے گی تجھے زخموں کا تیرے بھی حساب
مل ہی جائے گا کا تجھے بھی تجزیہ لکھا ہوا

اب قلم کاغذ کی حاجت کچھ نہیں باقی رہی
چہرہ چہرہ مل گیا ہے مرثیہ لکھا ہوا

گفتگو میں کیسی شامل ہوگیا عادل حیات
سب کی آنکھوں میں ہے تیرا عندیہ لکھا ہوا

Address:
37/89, Ground Floor
Woodside Apartment
Ghaffar Manzil, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

غزل

کاشف حسین غائر

کیا بتاؤں میں کدھر جاتا ہوں روز
اور کیا کیا سوچ کر جاتا ہوں روز
ٹوٹ جاتا ہوں ستارے کی طرح
گرد کی صورت بکھر جاتا ہوں روز
کیا قیامت ہے کہ جی اُٹھتا ہوں آپ
کیا قیامت ہے کہ مرجاتا ہوں روز
روز ہوجاتی ہے ان ہونی کوئی
باندھ کر رختِ سفر جاتا ہوں روز
اور کھو آتا ہوں اپنے آپ کو
ڈھونڈنے خود کو مگر جاتا ہوں روز
جس گلی کے موڑ پر بچھڑے تھے ہم
اس گلی کے موڑ پر جاتا ہوں روز
آخر شب اونگھنے لگتی ہے رات
لڑکھڑاتا میں بھی گھر جاتا ہوں روز

❁❁

Address:

غزل

راج کماری شرما راز

حوصلے جو سپاہ رکھتے ہیں
فتح سے، رستم وراہ رکھتے ہیں
جلنے والے چراغ کی مانند
ظلمتوں پر نگاہ رکھتے ہیں
جو سمندر صفت ہیں وہ لب پر
پیاس بھی بے پناہ رکھتے ہیں
جن کی وابستگی جرائم سے
سرپہ وہ بھی کلاہ رکھتے ہیں
جس سے انصاف پر نکھار آئے
وہ چمک بے گناہ رکھتے ہیں
روشنی کیا کسی کو دیں گے وہ
ذہن و دل جو سیاہ رکھتے ہیں
آستاں راز وہ فقیروں کا
خم جہاں سر کوشاہ رکھتے ہیں

❁❁

Address:
Dr. Raj Kumari Sharma Raaz
C/D-30, Kavi Nagar
Ghazia Bad : 201001

پنچھی بن

بھگوان داس اعجاز

ایک تو چہرہ بدنما اور ہاتھ نہ پانو
تم اپنا پہچان پتر بھول آئے کس گانو
اک چہرہ سو صورتیں، ہر صورت ہے مون
درپن درشاتا نہیں، میرے بھیتر کون
چہرہ جس کی آنکھ میں بے دائی نہ ایک
پانی پانی ہوگیا، آج آئینہ دیکھ
ہاتھ اُٹھا تو ایک تھا پتھر بھی تھا ایک
ٹوٹ گیا جب آئینہ چہرے ملے انیک
غور سے دیکھو آئینہ تیا گو یہ ابھیمان
ابھی مان جاؤ گے تم، دیکھ لیا شیطان
کون کون تھا لوٹ میں، کیوں بولوں گا جھوٹ
نام تو گنوا دوں سبھی میں جاؤں گا ٹوٹ
ہاتھ اُٹھے آکاش کو سب نے مانگے پھول
سب کے چہروں پر اگے، لمبے تیکھے شول
جس نے تیرے تیر سے ہنستے تیاگے پران
تو اس کا نزدیک سے چہرہ تو پہچان
اپنا تھا یا غیر تھا پھر کر لیجیے غور
دن میں چہرہ اور تھا دن ڈھلتے کچھ اور
لگتا ہے چہرہ مرا لوگ گئے ہیں بھول
مجھ سے چڑھوائے گئے میرے بت پر پھول

❀❀

Address:
T-451, Baljit Nagar
New Delhi : 110008

دوھے

بھگوان داس اعجاز

وہ بنیا میں باوری پڑھوں، نہ من کے بھاؤ
وہ لے پھول گلاب کے گاجر مولی بھاؤ
ان آنکھوں نے نہ کتنے چتر اتار
پتھر پر دکھلا مجھے اپنی کلا اتار
مورت تو موجود تھی بولا سنگ تراش
میں نے اس کا فالتو پتھر دیا تراش
میں گنتا دل دھڑکنیں اور تو دیکھی مار
مجھ پر پڑتے دیکھتی انتظار کی مار
جگت لڑائے ہم تھکے کتنے پاپڑ بیل
رتی چڑھی نہ چھت چڑھے خربوزے کی بیل
کورا کاغذ سونگھ کر گئے عبارت جان
خط کا اثر مل گیا آئی جان میں جان
سر خطرہ لے باڑھ کا کون بھرے گا مانگ
اُٹھنے لگی جہیز میں اب کشتی کی مانگ
پلیں رات کی کوکھ میں کتنے سخت سوال
جن کا اثر ڈھونڈتے ہم خود بنے سوال
دُکھ، دُکھ ہے، دُکھ مول ہے، آنسو دُکھ کا بھاگ
رونے سے کچھ دیر دُکھ دل سے جاتا بھاگ
جو ملتی گھر سے چلے منزل اپنے آپ
رستوں کی پہچان سے ونچت رہتے آپ

❀❀

اور زبانوں کا ادب

تخلیق | برتولت بریخت

عوام کی روٹی

انصاف عوام کی روٹی ہے
وہ کبھی کافی ہے، کبھی ناکافی
کبھی مزیدار ہے تو کبھی بدمزہ
جب روٹی عدم دستیاب ہے تب چاروں طرف بھوک ہے
جب بدمزہ ہے تب عدم اطمینان

خراب انصاف کو پھینک ڈالو
بغیر پیار کے جو بھونا گیا ہو
اور بغیر علم کے گوندا گیا ہو!

پورا، پڑا ہوا، بدبودار انصاف
جو دیر سے ملے، باسی انصاف ہے!

اگر روٹی مزیدار اور بھرپیٹ ہے
تو باقی کھانے کے بارے میں معاف کیا جا سکتا ہے
کوئی آدمی ایک ساتھ تمام چیزیں نہیں کھا سکتا

انصاف کی روٹی سے بھرپور
ایسا کام حاصل کیا جا سکتا ہے
جس سے قلب کو سکون ملتا ہے

جس طرح روٹی کی ضرورت روز ہے
انصاف کی ضرورت بھی روز ہے
بلکہ دن میں کئی کئی بار بھی
اس کی ضرورت ہے

صبح سے رات تک، کام پر، موج لیتے ہوئے
کام جو کہ ایک طرح کی امنگ ہے
دکھ کے دن اور سکھ کے دنوں میں بھی
لوگوں کو چاہئے
روز بروز بھرپور، غذائیت سے بھرپور انصاف کی روٹی

انصاف کی روٹی جب اتنی اہم ہے
تب دوستو، کون اسے پکائے گا؟
دوسری روٹی کون پکاتا ہے؟
دوسری روٹی کی طرح
انصاف کی روٹی بھی
عوام کے ہاتھوں ہی پکی چاہئے
بھرپیٹ، غذائیت سے بھرپور، روز بروز

بشکریہ: "کرنٹ لو" جنوری پور
اکتوبر - دسمبر ۲۰۰۵

چینی نظمیں

بانی ژونی

دوست کی نظم

ہاتھ میں تمہاری نظمیں
چراغ کی روشنی میں پڑھتا
اور ختم کر لیتا ہوں
پو پھٹنے تک
اس سے پہلے کہ باتی میں
تیل کم پڑ جائے
میری آنکھ تھک گئی ہے
بتی بجھا دیتا ہوں
اور اندھیرے میں بیٹھے سنتا ہوں
ندی کے کنارے سے
ہلکورے لیتی
ننھی لہروں کی آوازیں

بچھڑے ہوئے لوگ

کٹھن ہے وقت
میرے بھائیوں میں سے کچھ
چلے گئے پورب، کچھ پچھم
جنگوں نے کھیت اور باغان
کر دیا ویران
اور خاندان کے خاندان بے نشان
بھوتوں کی طرح پھرتے ہیں
اکھڑے ہوئے لوگ
یا بکھر جاتے ہیں
پت جھڑ کے پتوں کی طرح
آج ہم بٹے ہوئے ہیں
الگ الگ جگہوں میں
بانٹ رہے ہیں
ایک ہی چاند
ایک ہی کے آنسو
اور ایکسی فرقت

پابلو نیرودا

ایک نظم

وضاحت

تم پوچھو گے کہ کہاں ہیں وہ لائی لیک کے پھول
اور پوست کے پھولوں سے ڈھکا وہ خوابناک منظر
اور وہ بارش جو دیتی ہے لگاتار تھپیڑے
تمہارے لفظوں کو، بھرتی ہے انہیں
پانی کے نشانوں سے، پرندوں کی آوازوں سے

میں تمہیں وہ سب بتاؤں گا جو میرے ساتھ ہوا

میں رہتا تھا میڈریڈ کی
ایک بستی میں — چرچ اور
گھنٹہ گھروں کی صدا اور درختوں کے ساتھ
جہاں سے آپ دیکھ سکتے تھے
کاسٹیلے کا خشک چہرہ
گویا ہو کوئی بحر چرم
میرے گھر کو کہا جاتا تھا
پھولوں والا گھر کیونکہ اس کے چاروں طرف
کھلے رہتے تھے جیرینیم، یہ تھا
ایک خوبصورت گھر —
تھے ساتھ میں کتے اور بچے یہاں
راؤل، تمہیں یاد ہے نا؟
یاد ہے نا تمہیں رافیل!

فیڈریکو کیا تم یاد کر سکتے ہو
اپنی قبر سے ؟
کیا تمہیں یاد ہے بالکونیوں والا میرا گھر
جہاں جون کی روشنی گھول دیتی تھی تمہارے منہ میں
پھولوں کا مزہ
برادر! برادر!

میری بستی آرگیلس کے بازار
مچھلی کے استانوں کے بیچ
بیلچہ دوات جیسے مجسمہ کے ساتھ
شور شرابہ، نمکین شئے
دھڑکتے بریڈوں کے ڈھیر
کہ پھولوں میں بھرا زیتون کا تیل
پھڑکتے ہوئے پیروں اور ہاتھوں سے
متحرک سڑکیں
میٹر اور لیٹر جہاں
زندگی کا ماحصل
مچھلیوں کے لگے ڈھیر
وہ اس سورج کے چھتوں کے نقش و نگار جہاں
تھک جاتا ہے ہوا میں آکر
ہاتھی دانت میں خوبصورت، بے باک تراشے گئے آلو
لہریں ٹماٹر کی وسیع و عریض سمندر تک

اور ایک صبح جل رہا تھا وہ سب کچھ
اور ایک صبح آگ کی لپٹیں
نکل آئیں زمین سے
نگلنے لگیں لوگوں کو
اور پھر اسی لمحہ گولہ باری
بارود اسی لمحہ
اور خون اسی لمحہ

طیاروں اور موری فوج کے ساتھ قزاق
انگوٹھیوں اور ڈچوں کے ساتھ قزاق
سیاہ لباسوں میں دعائیں دیتے پادریوں کے ساتھ قزاق
آئے آسمان سے بچوں کا قتل کرنے

اور سڑکوں پر بہا بچوں کا خون
آسانی سے، بچوں کے خون کی طرح

گیدڑ جنہیں کوئی گیدڑ ہی ٹھکرا دے
گٹھلیاں جنہیں آوارہ گرد چبا کر تھوک دے
وائپر جن سے وائپر ہی نفرت کرے!

تمہارے خلاف میں نے دیکھا ہے اسپین کے
خون کو اٹھتے
تمہیں ڈبونے کو
فخر اور چاقوؤں کی ایک لہر میں!

دغاباز
جنرلو!
میرے اجڑے آشیانے کو دیکھو
دیکھو ریزہ ریزہ اسپین کو
یہاں ہر اجڑے آشیانے سے پھوٹ پڑتے ہیں خاکستر بھڑکتے
پھولوں کے بدلے
اسپین کے ہر بطن سے
اٹھ کھڑا ہوتا ہے اسپین
ہر مردہ بچے سے ابھر آتی ہے دور بین بندوق
ہر جرم سے پیدا ہوتی ہیں گولیاں
جو ایک دن ڈھونڈ نکالیں گی
دل تمہارے اندر

اور تم پوچھو گے: کیوں تمہاری نظم
بات نہیں کرتی ہم سے خوابوں کی اور پتوں کی
اور ہمارے وطن کے عظیم الشان آتش فشانوں کی

آؤ اور دیکھو خون سڑکوں پر
آؤ اور دیکھو
خون سڑکوں پر
آؤ اور دیکھو خون
سڑکوں پر

تخلیق | امریتا پریتم

وارث شاہ سے!

آج وارث شاہ سے کہتی ہوں
اپنی قبر میں سے بولو!
اور عشق کی کتاب کا
کوئی نیا ورق کھولو

پنجاب کی ایک بیٹی روئی تھی
تو نے اس کی لمبی داستان لکھی
آج لاکھوں بیٹیاں رو رہی ہیں
وارث شاہ! تم سے کہہ رہی ہیں:

اے دردمندوں کے دوست
پنجاب کی حالت دیکھو
چوپال لاشوں سے اٹا پڑا ہے
چناب لہو سے بھر گیا ہے

کسی نے پانچوں دریاؤں میں
زہر ملا دیا ہے
اور یہی پانی
دھرتی کو سینچنے لگا ہے

اس زرخیز دھرتی سے
زہر پھوٹ نکلا ہے
دیکھو سرخی کہاں تک آ پہنچی!
اور قہر کہاں تک آ پہنچا!

پھر زہریلی ہوا
ون جنگلوں میں چلنے لگی
اس نے ہر بانس کی بانسری
جیسے ایک ناگ بنا دی

ان ناگوں نے لوگوں کے ہونٹ ڈس لئے
پھر یہ ڈنک بڑھتے چلے گئے
اور دیکھتے دیکھتے پنجاب کے
سارے انگ نیلے پڑ گئے

ہر گلے سے گیت ٹوٹ گیا
ہر چرخے کا دھاگا ٹوٹ گیا
سہیلیاں ایک دوسرے سے بچھڑ گئیں
چرخوں کی محفل ویران ہو گئی

ملاحوں نے ساری کشتیاں
سیج کے ساتھ ہی بہا دیں
پیلوں نے ساری پینگیں
ٹہنیوں کے ساتھ توڑ دیں

جہاں پیار کے نغمے گونجتے تھے
وہ بانسری جانے کہاں کھو گئی

اور رانجھے کے سب بھائی
بانسری بجانا بھول گئے

دھرتی پر لہو برسا
قبروں سے خون ٹپکنے لگا
اور پریت کی شہزادیاں
مزاروں میں رونے لگیں

آج جیسے سبھی 'کیدو' بن گئے
حسن اور عشق کے چور
میں کہاں سے ڈھونڈ لاؤں
ایک وارث شاہ اور

وارث شاہ! میں تم سے کہتی ہوں
اپنی قبر سے اٹھو
اور عشق کی کتاب کا
کوئی نیا ورق کھولو!

تخلیق | کسم اگرج

وہ ایک —

تب کے ان گنت لوگوں میں
وہ بھی ایک
آزادی کے نعرے لگاتا
اور بندوق کی گولیاں سینے پر لے کر، وہ
مر کے گرا تھا —
تب ہر گاؤں کے گھر پر
پت جھڑ کے پتے کی طرح!

اُتنی ہی آسانی سے
وہ جھڑ کے گرا ہے
اب اتہاس کے پنّوں سے
ان گنت لوگوں کے ساتھ!!

ترجمہ: گلزار

خودکلامی | گلزار

ایمرجنسی

چاند کیوں ابر کی اُس میلی سی گٹھری میں چھپا تھا
اس کے چھپتے ہی اندھیروں کے نکل آئے تھے ناخن
اور جنگل سے گزرتے ہوئے معصوم مسافر
اپنے چہروں کو کھروچوں سے بچانے کے لئے
چیخ پڑے تھے

چاند کیوں ابر کی اُس میلی سی گٹھری میں چھپا تھا
اس کے چھپتے ہی اتر آئے تھے شاخوں سے لٹکتے ہوئے
آسیب تھے جتنے
اور جنگل سے گزرتے ہوئے رہ گیروں نے
گردن میں اترتے ہوئے دانتوں سے سنا تھا
پار جانا ہے تو پینے کو لہو دینا پڑے گا

چاند کیوں میلی سی گٹھری میں چھپا تھا
خون سے لتھڑی ہوئی رات کے رہ گیروں نے
دو زانو پہ گر کر
'روشنی، روشنی!' چلایا تھا، دیکھا تھا فلک کی جانب
چاند نے گٹھری سے اک ہاتھ نکالا تھا
دکھایا تھا چمکتا ہوا خنجر!!

چاند کیوں ابر کی اُس میلی سی گٹھری میں چھپا تھا؟

زنگ لگے اس چاند کو میں نے —

زنگ لگے اس چاند کو میں نے
کتنا رگڑ رگڑ کے 'ریتی'، 'ریگمار' سے صاف کیا ہے
کنگرے ٹوٹنے لگتے ہیں اب
گھس گھس کے جب زنگ ہٹاتا ہوں نوکوں سے!

کند نہ ہو جائے اس چاقو جیسے چاند کی دھار کہیں
کالی اندھیری راتیں جب جب کاٹنی ہوں گی
یہ چاقو پھر کام آئے گا!!

یُدھ

سورج کے زخموں سے رِستا لال لہو
دور افق سے بہتے بہتے اس ساحل تک آ پہنچا ہے
کرنیں مٹی پھانک رہی ہیں
سائے اپنا پنڈ چھڑا کر بھاگ رہے ہیں
تھوڑی دیر میں لہرائے گا چاند کا پرچم

رات نے پھر رَن جیت لیا ہے
آج کا دن پھر ہار گیا کیوں!!

زنداں نامہ

چاند لاہور کی گلیوں سے گزر کے اک شب
جیل کی اونچی فصیلیں چڑھ کے
یوں 'کمانڈو' کی طرح کود گیا تھا 'سیل' میں
کوئی آہٹ نہ ہوئی
پہرے داروں کو پتہ ہی نہ چلا

فیض سے ملنے گیا تھا، یہ سنا ہے
فیض سے کہنے 'کوئی نظم کہو
وقت کی نبض رُکی ہے
کچھ کہو —
وقت کی نبض چلے!

تخلیق | وندا کرندیکر

دانتوں سے دانتوں تک

میں اور تم
صرف دانتوں سے دانتوں تک دوڑ سکتے ہیں
جب میرا سینہ کچل دیا گیا
پہاڑ کے پتھر کے نیچے
تو رینگتی ہوئی می مجھے دیکھ کر مسکرائی
تم نے کہا—
کیا فرعون کی شادی
کل اس کی بہن سے ہو جائے گی؟
میں نے کہا—
کیا تختوں پر بچھا ہوا جو شمن
کل صبح تک رہے گا ٹھیک ٹھاک؟
اس نے کہا—
وہ جو اسفنکس نام کا دانو ہے
اس کے پتھر کے پاؤں رکھے ہوئے ہیں
ہر آدمی کے سر پر
ایک خاموش دھڑ تمہارے پیچھے ہے
ایک خاموش دھڑ میرے پیچھے
میں اور تم
صرف دوڑ سکتے ہیں دانتوں سے دانتوں تک
مکن کی عظیم الشان دیوار کے
ہر کونے پر ایک بھوت ہے
یہاں تک کہ اس کے پتھر بھی دیکھتے ہیں
• ایک قدرت کی گلی سے
کیا کشیدہ کاری بھی گھس سکتی ہے
گتھیو بس کے لبادے سے؟
کیا خود بدھ
میری پیٹھ کے کوبڑ کو کچل سکتے ہیں؟
اس نے کہا—
آخر یہ تہذیب کی سرنگ
کس کے لئے ہے؟

جو ہوتا ہے وہ ہو چکا
تاریخ کی چھاتی درک گئی ہے
میں اور تم
صرف دانتوں سے دانتوں تک دوڑ سکتے ہیں
جمنا کے پانی میں
کالیا ناگ پھر سے پھن اٹھا رہا ہے
متحمل تاج محل
اب بھی مستعد کھڑا ہے اس کے ساحل پر
تم نے کہا—
پیار کی سادگی پر
پتھر کا پھول کھلا ہے
میں نے کہا—
دھیرے دھیرے جمنا کی طرف
جھک رہا ہے تاج محل
اس نے کہا—
شب تار کا ہاتھی

زمین کے آگے جھول رہا ہے
نیو کے اندر کیا چھپا ہے؟
کیا وہاں ملی چنا دیئے گئے کسی شخص کی لاش سڑ رہی۔
تم اور میں
صرف دانتوں سے دانتوں تک دوڑ سکتے ہیں
ہم سفر کر سکتے ہیں
صرف دانتوں سے دانتوں تک
کالے دانت، سفید دانت
دانت ٹوٹے ہوئے، دانت سڑے ہوئے
دانت دور اندیش اور دانت بے وقوف
کچھ کومل، کچھ کٹھور
کچھ پیلے پادامی
کچھ بے باک، کچھ خاموش
کچھ سونے چاندی سے مڑھے ہوئے
تم اور میں صرف چھلانگ لگا سکتے ہیں
دانتوں سے دانتوں تک
میں نے جان لیا ہے کہ ایک سونے کے رتھ میں بیٹھ کر
خدا یہاں سے کہیں اور چلا گیا ہے
اس رتھ کی لیک ہر آدمی کی چھاتی پر
دیکھی جا سکتی ہے
چاروں طرف صرف دھڑ ہی دھڑ دکھائی دیتے ہیں
تاریخ کی چھاتی درک گئی ہے
اس سب میں بھلا نیا کیا ہے؟
تم اور میں صرف دانتوں سے دانتوں تک
دوڑ سکتے ہیں

وندا کرندیکر کو اس سال کے
گیان پیٹھ اعزاز سے نوازا گیا ہے۔

جل سمادھی

ہندی : کملیشور　　　اُردو : حیدر جعفری سیّد

بڑی بات یہ تھی کہ رام لکھن نرمدا باندھ پروجیکٹ کے بڑے انجینئر صاحب کا چپراسی تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ اسی کا قصبہ ہرسود باندھ پروجیکٹ کے ڈوب والے علاقے میں آ گیا تھا۔ کھنڈوا شہر سے ساٹھ کلومیٹر دور، سات سو سال پرانا، تقریباً پچیس ہزار باشندوں کا قصبہ۔ ہرسود کو شہر بننے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ آس پاس کی تحصیلوں کے لیے وہ شہر ہی تھا کیونکہ وہاں اسکول بھی تھے اور چھوٹی عدالتیں اور معمولی سا ہسپتال بھی، اسکول میں تحصیل والی بستیوں کے بچے بھی پڑھنے آتے تھے۔

یہیں تھا رام لکھن کا پشتینی گھر، جہاں اس کے سارے ہی گھر والے رہتے تھے۔ خاندان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ گھر میں اماں، باپو، دو بہنیں، ایک چھوٹا بھائی اور خود اس کی بیوی اور ایک ننھا سا بیٹا۔ لیکن خاندان میں ایک ممبر اور تھا، اس کا نام تھا کن چھیدی لال وہ بھی گلی کے باہر کھتار خانے والے کوڑے کے ڈھیر پر پیدا ہوا تھا۔ اس کے بھی دو تین بھائی بہن اور تھے لیکن رام لکھن جب چھوٹا تھا، تب ہی اس پلے کو اُٹھا لایا تھا۔ اس نے اس کا نام رکھا تھا موتی۔ اس کا نام کن چھیدی لال کیسے پڑا، اس کی بھی بہت بڑی ہی مزیدار گھریلو کہانی ہے۔ اماں نے جب دونوں چھوٹی بہنوں کا کن چھیدن کیا تب ہی موتی کا بھی ایک کان چھید دیا تھا۔ اور اس میں کپور لگا کر کالا ڈورا پہنا دیا تھا۔ بہنوں کو کانوں میں کپور لگا کر چاندی کی ہلکی ہلکی بالیاں پہنا دی گئی تھیں اور ناک میں نیم کی ٹہنی کا ٹکڑا ڈال کر اوپر سے کپور تھوپ دیا گیا تھا تا کہ زہر باد نہ ہو۔ ایک طرح سے کہیں سب ہی کی نالیں گھر میں ہی گڑی ہوئی تھیں۔ موتی کی نال بھی گلی کے باہر کھتار خانے پر گڑی تھی۔ اماں نے جب سے اس کا کان چھیدا تب ہی سے موتی کو کن چھیدی لال پکارنے لگی تھیں۔ وہ خاندان کا فرد ہے۔

تو خیر، یہ پرانی بات ہے۔ نئی بات یہ ہے کہ ہرسود نرمدا باندھ پروجیکٹ کے لیے ڈوب علاقے میں آ گیا تھا۔ اب یہ بات دوسری ہے کہ آپ چاہے اس کا نام اندرا ساگر باندھ رکھیں یا نرمدا باندھ۔ ویسے ہی آپ کن چھیدی لال کو آپ کن چھیدی لال پکاریں یا موتی۔ باندھ تو باندھ ہے۔ کن چھیدی تو کن چھیدی ہی رہے گا۔

اور جب سے بستی میں یہ خبر پکی ہوگئی ہے کہ ہرسود ڈوب علاقے میں آ گیا ہے آبادی کی بے چینی بے حد بڑھ گئی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب ہوگا کیا کیسے ہوگا اور گھٹنوں سے ٹوٹی زندگی چلے گی کیسے پکی خبر کے بعد پہلی شام اُتری تو لگا جیسے موت کی کالی چادر اُتر رہی ہو۔ پسرتی موت کے اس بے چین سناٹے میں لوگ گلیوں کے نکڑوں اور تنگ چوراہوں پر جمع ہو گئے تھے ہر گھر کا کوئی نہ کوئی مرد یا عورت ان جھنڈوں میں شامل تھا۔ سب کی

ادھر مری اُمید تھی کہ شاید سے فیصلہ ٹل جائے گا۔نہیں ٹلے گا تو ٹلوانا پڑے گا۔آخر سید حا لکر کی نرمدا بچاؤ تحریک اسی پرسود سے تو شروع ہوئی تھی۔

اور پھر اس ودھان سبھا علاقے کے ودھا ئک کا گھر بھی تو اسی پرسود میں ہے۔وہ چاہے رہتے بھوپال میں ہوں لیکن پشتینی طور پر تو یہیں کے ہیں کچھ نہ کچھ تو ہوگا ہی...... یہ صحیح ہے کہ حال تکلیف دہ ہے پر کچھ بھی ہو، مستقبل کی اُمید ٹوٹی تو نہیں ہے۔برسوں سے کئی بچے مستقبل کو لانے کے لیے کھنڈوا، جبل پور، بھوپال، کولکاتا، بمبئی، دلی وغیرہ کی طرف گئے ہوئے ہیں۔وہ آخر ،ایک نہ ایک دن اپنے گھروں کو لوٹیں گے۔نہ بھی لوٹیں تب بھی چونا مٹی سے اپنے پشتینی گھروں کی مرمت ہی تو کروا ہی دیں گے...... حال خواہ جتنا ہی بھیانک ہو لیکن غیر یقینی مستقبل میں تو نہیں جیا جا سکتا۔موت سے زیادہ بھیانک ہوتا ہے۔

اجڑنا، اُمیدوں کا خالی ہو جانا۔

لیکن ہوا وہی جو ہونا تھا۔آخر اجڑنے کا سرکاری فرمان آ ہی گیا اور اجڑنے کے آخری دن کا اعلان بھی کر دیا گیا، تیس جون!اور تب اخباروں اور میڈیا نے مسئلے کو اُٹھا لیا۔سرکاری موت کے اس فرمان نے اعلان کیا کہ ڈوب میں جانے والے پرسود کو وہاں سے سولہ کلو میٹر دور چھیرا میں بسایا جائے گا۔متاثرین کو مناسب معاوضہ دیا جائے گا۔

رام لکھن کے بڑے انجینئر صاحب نے جب پریس کانفرنس میں یہ بیان دیا تو اس کے دل پر ہتوڑا سا پڑا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور ٹانگیں کانپنے لگیں لیکن وہاں سے ہٹ تو نہیں سکتا تھا کیونکہ باندھ کالونی کے بنگلے تک صاحب کا بیگ، فائلیں اور کفن کا ڈبہ تو اُسے ہی اُٹھا کر لے جانا تھا۔یہ سرکاری نوکری ہی تو اس کا مستقبل تھی، لیکن رات کو بنگلے کے آوٹ ہاؤس کی اپنی کوٹھری میں جب وہ پہنچا تو سر پھٹا جا رہا تھا کھانا بنانا دشوار تھا، بھوکا ہی پڑا رہا...... نیند کہاں؟ رات بھر گھر والوں کے بارے میں سوچتا رہا۔آج کل خبریں تو بہت جلدی پہنچتی ہیں، بستی میں پھر پہنچی ہوگی تو گھر والوں اور بستی کے تمام لوگوں پر کیا بیتی ہوگی! صبح تیار تو ہونا ہی تھا، ان دنوں کام بہت تھا، چھٹی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

لیکن پریس اور میڈیا نے یہ مسئلہ لپک لیا۔محاورے میں کہیں تو تیس جون کا دن پرسود والو کے لیے نادر شاہی قتل کا دن تھا۔میڈیا کے ایک جوشیلے صحافی منوہر نے تو پرسود تیس دن ایک کتاب ہی لکھ ڈالی۔میڈیا میں انہوں نے اور رویندر شاہ نے مرتے ہوئے پرسود کو بائیس دنوں تک لگا تار قید کیا۔اخبارات بھی چیخے ارن دھتی رائے جیسی انتظامیہ مخالف قلم کار نے لکھا۔بغداد! ہاں بغداد اور ہرسود کی تباہی میں بہت مماثلت ہے دونوں گلو بلائزیشن کی گھناؤنی مثالیں ہیں جہاں حکومت خود بھومافیا میں بدل گئی ہے اور انسانیت کے جینے کے اختیار کو کنارے رکھ کر حکومت خود ملکی اور غیر ملکی کمپنیوں کا منافع یقینی بنانے کے لیے مظلوموں کو اجاڑ رہی ہے اور بے شری

پنگلے نے تو سرکار کی پوری پول پٹی ہی کھول دی۔ سرکار پیشہ ور بھو مافیا کے لباس میں غیر انسانی طریقوں سے ہرسود کو خالی کروانے کے لیے آمادہ ہوگئی۔ فرمان تھا کہ اپنے گھروں کو خالی کرنے کا معاوضہ ملے گا لیکن اپنے پشتینی گھروں کو خود ڈھاؤ اور چھنیرا میں جا کے بس جاؤ۔ ورنہ معاوضہ کا پیسہ نہیں ملے گا سرکار کو ڈر تھا کہ ہرسود کے باشندے معاوضہ لے کر کہیں پھر سے اپنے مکانوں میں رہنے نہ آجائیں۔...

ہرسود والے خود ہی اپنے گھروں کو تباہ کر رہے تھے۔ چھنیرا میں سرکار نے گھر تو نہیں بنوائے تھے لیکن ہرسود والوں کو خانہ بدوش بنا کر وہاں کی پتھریلی زمین پر ان کے ٹھہرنے کے لیے ٹین کے چھپر ضرور ڈلوا دیے تھے۔

رام لکھن کو چھٹی ملی تھی کہ وہ اپنا گھر توڑ کر خاندان والوں کو چھنیرا میں بسانے کے لیے جا سکے اس کے ساتھ اس کا دوست اتواری بھی آیا تھا۔ اسے بھی بستی چھوڑنی تھی۔ اسی ہنگامے اور افراتفری کے دوران اپنے گھر ڈھانے کے بعد رام لکھن جب اتواری کے ساتھ بازار کی طرف نکلا تو چیخ پکار جاری تھی۔ اس ماتمی ماحول میں کن چھیدی پیچھے پیچھے اس کے ساتھ چلا آیا تھا۔ پورا ہرسود جیسے بمباری سے تباہ و برباد ہو گیا تھا فرق اتنا ہی تھا۔ کہ لاشیں چل پھر رہی تھیں۔ وہ چھنیرا کی نئی بستی کی طرف جا رہی تھیں۔ رام لکھن اور اتواری بھی اپنے خاندانوں کو لے کر چھنیرا چلے گئے تھے۔ اماں کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ان کا اور سب ہی کا کن چھیدی لال چھنیرا کی بستی تک پہنچا تھا۔ نقل مکانی کے لیے ملی چھٹیاں ختم ہوتے ہی رام لکھن اور اتواری ڈیوٹی پر لوٹ گئے تھے۔ کن چھیدی کے ساتھ باقی خاندان چھنیرا میں رہنے لگا تھا۔ لیکن دس پندرہ دن بعد کن چھیدی غائب ہو گیا تھا اور ایسا غائب ہوا تھا کہ پھر نظر ہی نہیں آیا۔ سب سے زیادہ افسوس اماں کو ہوا سوچا کہیں چلا گیا ہوگا۔ لوٹ آئے گا۔ لیکن وہ نہیں آیا۔ اماں نے یہی سوچ کر صبر کر لیا کہ کسی ٹرک ورک کے نیچے آ کر مر کھپ گیا ہوگا، ٹرکوں کی آمد و رفت شروع ہوگئی تھی۔ کیونکہ ہرسود میں باندھ کی دیوار بنانے کا کام شروع ہو چکا تھا۔

سال گزرتے گزرتے باندھ کا ایک سو نوفٹ اونچا پشتہ بن چکا تھا، چھوٹے صاحب معائنہ کرنے آ رہے تھے تو اتواری نے رام لکھن کو بھی ساتھ لے لیا تھا کہ ایک دن کے لیے چھنیرا میں گھر والوں کے پاس بھی ہوتے آئیں گے۔ باندھ پر مرمت اور دیکھ بھال کے لیے اوپر تک پہنچنے والی سیڑھیاں تھیں۔ دونوں اوپر پہنچے تو دیکھا۔ پانی کا بہاؤ شروع ہو چکا تھا۔ جگہ جگہ پانی بھر رہا تھا۔ ڈوب میں آدھے پونے ڈوبتے کھنڈر اب بھی دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں نے سب سے پہلے اپنے گھروں اور محلے کو پہچانا۔ پھر بہت دیر تک بستی کی الگ الگ عمارتوں اور پہچان والوں کے گھروں کو پہچانا۔ لیکن وہ گلیاں ڈوب چکی تھی جن میں ان کا بچپنا بیتا تھا پانچ دس دنوں میں پورا ہرسود جل سمادھی میں غائب ہونے والا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی نظر بچا کر اپنی اپنی آنکھیں پونچھ لیں لیکن آنسو رہ رہ کے آ ہی جاتے تھے۔ آ کر کب تک ایک دوسرے سے آنکھیں چراتے۔

لوٹنے لگے تو دیکھا پتھر کے پشتے پر کن چھیدی موجود تھا۔ تھا تو کن چھیدی ہی۔ اس کے کان میں کالا ڈورا

بھی موجود تھا۔ اس نے بھی دیکھا۔ وہ دوڑ کر آیا اور رام لکھن کی ٹانگوں سے لپٹنے لگا۔ اِدھر اُدھر چاٹنے، پنجہ مارنے لگا۔ رام لکھن نے اٹھا کر گودی میں بھر لیا۔ کچھ پلوں تک لاڈ پیار کا سلسلہ چلتا رہا۔ لوٹنے لگے تو رام لکھن نے اسے اتارا اور چٹکی بجا کر ساتھ آنے کا اشارہ کیا ساتھ ساتھ سیڑھیاں اتر کر تینوں چھنیرا کی جانب چل دیے

میل سوا میل کے بعد رام لکھن نے یکا یک دیکھا کن چھیدی غائب تھا۔ اس نے رک کر زور زور سے پکارا کن چھیدی! موتی! ...... موتی! کن چھیدی! لیکن اس کا کہیں اتہ پتہ نہیں تھا۔ آخر ہار کر رام لکھن اور راتو ا، ، چھنیرا کی طرف بڑھے چلے گئے۔ گھر بھی پہنچنا تھا۔

❀❀

Ad lress:
C/o Sadaf
88/163 Chamanganj
Kanpur : 208001

بھیڑیا

فرانسیسی : ہرمَن ہیسے　　　　　　اُردو : نجم الدین احمد

اُس سے پہلے کبھی فرانسیسی پہاڑوں پر اتنی شدید سردی نہیں پڑی تھی اور موسم سرما بھی اتنا طویل نہیں ہوا تھا۔ ہفتوں تک ہوا صاف، تیکھی اور سرد رہی تھی۔ دن کے وقت عظیم الشان ڈھلوانی برفانی میدان مٹیالے سفید اور تا حد نگاہ پھیلے نظر آتے تھے۔ رات کو ان پر سے چھوٹا، شفاف، ناراض اور سرد مہر چاند گزرتا تھا۔ برف پر اس کی نیلگوں روشنی مدھم نیلی ہو کر چمکتی تھی، جو بذاتِ خود سردی کا جوہر لیے ہوتی تھی۔ خاص طور پر پہاڑوں کو جانے والی اونچی سڑکیں اور پگڈنڈیاں سنسان ہو گئی تھیں۔ لوگ بستیوں میں اپنے اپنے گھروں میں کاہلی سے پڑے بڑبڑاتے رہتے تھے۔ رات کو کھڑکیاں نیلی چاندنی میں دھواں نما سرخ ہو کر چمکتیں اور جلد ہی اندھیرے میں ڈوب جاتیں۔

علاقے کے جانوروں کے لیے کڑا وقت تھا۔ بہت سے چھوٹے جانور اور پرندے ٹھٹھر کر مر چکے تھے اور ان کی نحیف و نزار لاشیں عقابوں اور بھیڑیوں کی خوراک بن چکی تھیں۔ لیکن وہ بھی بُری طرح ٹھنڈ اور بھوک کے مارے ہوئے تھے۔ اس علاقے میں بھیڑیوں کے صرف چند خاندان بستے تھے اور مصیبت نے انہیں اکٹھا رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دن میں ان میں سے کوئی ایک باہر نکلتا۔ وہ برف میں مارا مارا پھرتا۔ وہ کمزور، بھوکا، چوکنا اور کسی بھوت کی طرح غصیلا ہو رہا ہوتا۔ اس کا سایہ اس کے قریب ہی برف کی سفیدی میں چمکتا ہوتا۔ وہ اپنی نوکیلی تھوتھنی ہوا میں گھماتا اور سونگھتا۔ وہ وقتاً فوقتاً خشک اور زخمی انداز میں کراہتا۔ لیکن رات کو وہ سب اکٹھے باہر نکلتے اور بستیاں ان کی دردناک بندوقیں میں گھر جاتیں۔ مویشیوں اور مرغیوں کو احتیاط سے بند کیا ہوتا تھا اور قوی ہیکل کندھوں پر بندوقیں تیار ہوتی تھیں۔ شاذ و نادر ہی بھیڑیے کتے یا کسی دوسرے چھوٹے جانور کا شکار کر پاتے جب کہ بھیڑیوں میں سے دو کو پہلے ہی گولی سے مارا جا چکا تھا۔

سردی کا موسم جاری رہا۔ اکثر بھیڑیے گرمی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے میں گھر جاتے اور انڈے سینے والی مرغی کی طرح پڑے اپنے اردگرد پھیلے مردہ علاقے کے سناٹے کو خوف میں ڈوبے اس وقت تک سنتے رہتے جب تک کہ ان میں سے کوئی بھوک سے بلبلا کر اچانک ہی اوپر کو نہ اُچھلتا اور دہشت ناک انداز میں دھاڑنے لگتا۔ تب وہ سارے اپنی تھوتھنیاں اس کی طرف موڑتے، خوف سے کانپنے لگتے اور پھر سب مل کر وحشت ناک، ڈرا دینے والی اور اداسی بھری چیخیں مارنے لگتے۔

بالآخر ان میں سے ایک چھوٹے گروہ نے وہاں سے کوچ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ علی الصبح انہوں نے اپنے بھٹ چھوڑ دیے اور جمع ہو کر تشویش اور برانگیختگی سے منجمد ہوا میں سونگھنے لگے۔ پھر وہ تیز تیز اور قدرے اُچھلتے ہوئے چلنے لگے۔ پیچھے رہ جانے والوں نے ان کو عقب سے اپنی چمکتی ہوئی کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کے پیچھے چند قدم چلے، رکے اور کچھ دیر ہچکچاہٹ کے عالم میں کھڑے رہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنے خالی

بھٹوں میں چلے گئے۔

دوپہر کے وقت مسافروں کا گروہ دو میں تقسیم ہوگیا۔ تین بھیڑیوں نے سوس جیورا کی طرف جانے والی مشرقی سمت پکڑلی جب کہ دوسروں نے جنوبی سمت میں سفر جاری رکھا۔ وہ تینوں مضبوط کاٹھی کے لیکن خوفناک حد تک لاغر تھے۔ ان کے ہلکے رنگ کے اندر کو دھنسے ہوئے پیٹ کی طرح کم چوڑے تھے۔ ان کی پسلیاں ترحم کی حد تک ان کے سینوں پر نمایاں تھیں۔ ان کے منہ خشک اور آنکھیں باہر کو ابلی ہوئیں اور مایوسی کا مظہر تھیں۔ وہ جیورا میں دور تک چلے گئے۔ اگلے روز انہوں نے ایک بھیڑ اور اس سے اگلے روز ایک کتے اور پھر اگلے روز ایک بچھیری کو مار ڈالا۔ اشتعال میں آئے ہوئے دیہاتیوں نے ان کا شکار شروع کر دیا۔ علاقے کے دیہاتوں اور قصبوں میں نامعلوم مداخلت کاروں کا خوف پھیل گیا۔ برف گاڑیاں مسلح ہو کر چلنے لگیں۔ ایک گاؤں سے دوسرے کو جانے والے اپنے ساتھ بندوقیں رکھنے لگے۔ ایسی احتیاطوں کے بعد تینوں بھیڑیں نے فوراً ہی اس اجنبی علاقے میں مقابلے اور غیر یقینی کے ماحول کو محسوس کرلیا۔ جتنی اپنے علاقے میں وہ جان خطرے میں ڈالتے تھے انہوں نے اس سے زیادہ خطرہ مول لیتے ہوئے مویشیوں کے ایک باڑے کو دن دیہاڑے توڑ ڈالا۔ چھوٹی سی گرم عمارت گائیوں کے ڈکرانے، لکڑی کی پھٹیوں کے ٹوٹنے، پیروں کے پٹخے جانے اور بھیڑیوں کی گرم اور بھوکی سانسوں کی آوازوں سے بھر گئی تھی۔ لیکن اس بار لوگ پہنچ گئے۔ بھیڑیوں کو مزہ چکھایا گیا، جس سے کسانوں کے حوصلے دوگنے ہوگئے۔ انہوں نے ایک کو گردن میں گولی مار کر ہلاک کیا اور دوسرے کو کلہاڑے سے ذبح کر دیا۔ تیسرا بھاگ نکلا اور اس وقت تک دوڑتا رہا جب تک کہ ادھ موا ہو کر برف پر نہ گر پڑا۔ وہ بھیڑیوں میں نوجوان اور سب سے زیادہ خوب صورت تھا۔ اس کا سینہ قابلِ فخر، مضبوط اور دیدہ زیب تھا۔ وہ بہت دیر پڑا ہانپتا رہا۔ خون جیسے سرخ دائرے اس کی نظروں کے سامنے چکرا رہے تھے۔ کبھی کبھار اس کے منہ سے دردناک اور تکلیف بھری کراہ نکل جاتی تھی۔ تاک کر زور سے نشانہ لگایا ہوا ایک کلہاڑا اس کی کمر سے ٹکرایا تھا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو سنبھال کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ صرف اسی وقت اس نے دیکھا کہ وہ کتنی دور تک دوڑا تھا۔ بہت دور تک کہ جہاں بندہ نہ بندے کی ذات تھی۔ اس کے سامنے برف سے ڈھکا ہوا عظیم الشان چیسرل کا پہاڑ تھا۔ اس نے اس کے گرد سے گھوم کر جانے کا فیصلہ کیا۔ سخت پیاس کے عالم میں اس نے سخت جمی ہوئی برف کی سطح پر چند منہ مارے۔

پہاڑ کی دوسری طرف اس نے ایک گاؤں دیکھا۔ رات ہو رہی تھی۔ وہ انتظار کرنے کے لیے صنوبر کے درختوں کے جھنڈ میں ٹھہر گیا۔ پھر اس نے چوکنے پن سے باغ کے جنگلوں کے پاس سے ہوتے ہوئے مویشیوں کے گرم باڑوں کی بو کا تعاقب کیا۔ گلی میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے خوف زدہ انداز میں ندیدے پن سے گھروں کے بیچ جھانکا۔ گولی داغی گئی۔ اس نے اپنا سر واپس کھینچا اور بھاگنے کو ہی تھا کہ دوسری گولی چلائی گئی جو اسے لگ گئی۔ اس کے سفید پیٹ کی ایک سمت خون سے لت پت ہوگئی۔ خون بڑے قطروں کی صورت میں نیچے گرنے لگا۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ جیسے اڑتا ہوا جنگل سے بھرے پہاڑ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہاں ٹھہر کر وہ ایک لمحے کے

لیے سماعت بر گوش ہوا۔ اس نے دور سے آتی ہوئی آوازیں اور قدموں کی چاپیں سنیں۔ اس کے اندر خوف بھر گیا۔
اس نے پہاڑ کے اوپر کی جانب دیکھا۔ راستہ ڈھلوانی، درختوں۔ - اٹا ہوا اور چڑھائی مشکل تھی۔ لیکن اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ ہانپتے ہوئے اس نے ڈھلوان سطح پر چڑھنا شروع کیا۔ اس کے پیچھے نیچے سے آتا ہوا لعن طعن کا طوفان، احکامات اور لالٹینوں کی روشنیاں پہاڑ سے ٹکرا رہی تھیں۔ خوف سے کانپتے ہوئے زخمی بھیڑیا نیم روشنی میں درختوں میں سے ہوتا ہوا اوپر چڑھتا گیا اور کتھئی خون اس کے پہلو سے آہستہ آہستہ ٹپکتا رہا۔

سردی بڑھ گئی تھی۔ مغرب میں آسمان کہر آلود ہو کر برف گرنے کا اشارہ دے رہا تھا۔

آخر کار نکلتی ہوئی جان کے ساتھ وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ ہی گیا۔ وہ بڑے اور قدرے نیچے کی طرف ترچھے برف کے میدان کے کنارے پر تھا جو مونٹ کروسن سے زیادہ دور نہیں تھا اور اس گاؤں سے بہت اونچا تھا جہاں سے وہ جان بچا کر بھاگا تھا۔ اسے بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن اس کے زخم میں مسلسل تکلیف دہ درد ہو رہا تھا۔ اس کے مضمحل جبڑوں سے کمزور اور بیمار کراہ نکلی۔ اس کے دل کی دھڑکن بھاری اور درد انگیز ہو رہی تھی اور دل پر موت کا ہاتھ وزنی شے کی طرح رکھا ہوا تھا۔ شاخیں پھیلائے ہوئے صنوبر کے ایک تنہا درخت نے اسے پناہ دی۔ وہ اس کے نیچے بیٹھ گیا اور لاچاری سے برفیلی اندھیری رات میں گھورنے لگا۔ یونہی آدھ گھنٹا گزر گیا۔ پھر سرخ رنگ کی عجیب سی مدہم روشنی برف پر گری۔ کراہتے ہوئے وہ کھڑا ہوا اور اس نے اپنا خوب صورت سر روشنی کی طرف گھمایا۔ بڑا اور لہو جیسا سرخ چاند جنوب مشرق سے طلوع ہو کر آہستہ آہستہ کہر زدہ آسمان پر اوپر کی سمت سفر کر رہا تھا۔ بہت سے ہفتوں سے تو چاند اتنا بڑا اور سرخ نہیں تھا۔ مرتے ہوئے بھیڑیے کی آنکھیں افسوس ناک انداز میں دھندلی ٹکیہ سے چمٹ کر رہ گئیں۔ ایک بار پھر ہلکی سی غراہٹ دردناکی لیے رات کے سناٹے میں گونجی۔

تب وہاں قدموں کی آوازیں اور روشنیاں آنے لگیں۔ موٹے کوٹوں میں کسان، فرکی ٹوپیوں اور بے ڈول پاجاموں میں شکاری اور لڑکے برف پر گھسٹتے ہوئے پہنچ گئے۔ فاتحانہ چیخ اُبھری۔ انہوں نے مرتے ہوئے بھیڑیے کو دیکھ لیا تھا۔ فوراً ہی دو گولیاں چلیں۔ دونوں نشانے پر نہ بیٹھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ تو پہلے ہی سے مر رہا تھا۔ وہ اس پر لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے جت گئے۔ اس کے بعد وہ احساس سے ماورا ہو گیا۔

اس کی ہڈیاں توڑ کر وہ اسے گھسیٹتے ہوئے سینٹ امر (Saint Immer) لے گئے۔ انہوں نے قہقہے لگائے۔ شیخیاں بگھاریں، گیت گائے، لعنتیں برسائیں اور برانڈی اور کافی کے حق دار ٹھہرے۔ ان میں سے کسی نے بھی جنگل کو ڈھانپنے والی برف کے حسن کو یا بلند سطح مرتفع کی تابانی کو یا چیرل پر لٹکے سرخ چاند کو نہیں دیکھا جس کی مدھم چاندنی ان کی بندوقوں کی نالیوں پر، شفاف برف پر اور مردہ بھیڑیے کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں ٹمٹما رہی تھی۔

❀❀

Address:
Najamuddin Ahmad, 259-61E, Block Z Model Town, Bahawalnagar (Punjab)

افسانہ

پنجابی : افضل راجپوت اُردو : سلیم شہزاد

اس نے غم اور خوشی کے کانٹوں پر ساری رات یوں کروٹیں بدل بدل کر گزار دی جیسے عمر قید کے قیدی کی آخری رات کا سورج طلوع ہونے کا نام ہی نہ لے رہا ہو۔ آئینے کے روبرو کھڑے ہو کر اس نے مختلف سوٹ اور کمبی نیشن پہن کر خود پر تنقیدی نظر ڈالی مگر اس کی نظروں میں کوئی بھی نہ جچا، یہودیوں کی غلامی میں مشقتوں کی کنڈیالی ٹائی اور اس کی گردن۔ اجداد کی قبریں تو خیر چھوڑ و وہ تو مٹی کی ڈھیریاں ہوتی ہیں۔ وطن ان کی بھی بس یونہی باتیں ہیں۔ ہر جگہ ایک دھرتی اور ایک امبر ہے۔ سب وطن ہی وطن ہے۔

انجلا جو اس کے لیے گرین کارڈ کا سنہری پھول توڑنے کی سیڑھی تھی، اولڈز موبائل ریگل میں بیٹھی رہی اور وہ اپنی انگلیوں سے کنگھی کرتا، ٹائی کی ناٹ درست کرتا ہوا امیگریشن کے چمکیلے دفتر میں داخل ہوا۔ ''ہائے۔'' کہہ کر وہ بیٹھا تو آواز سنائی دی۔ ''محمد کلیم رسول۔''

''تھینک یو سر، یس سر! میرا اصل نام تو اب ''مائیکل جارج رسل'' ہے۔ یہ رہا میونسپلٹی کا ایفی ڈیوٹ۔'' افسر پتھر جیسی نیلی آنکھیں ملا کر ہنسے تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مسجد میں گھسا ہوا خنزیر ہو مگر منجن کے اشتہاری کی طرح اس نے منہ پر مسکان جمائے رکھی۔

''ڈلاس میں کون امریکی صدر قتل ہوا تھا؟''

''یہ بات تو بچہ بھی جانتا ہے آفیسر، آئی تھنک جے ایف کینیڈی۔''

''قومیت کیوں بدلنا چاہتے ہو؟''

''سوویٹ لوگ مجھے بیک ورڈ پاکستانی نہ سمجھیں، ہر ایئر پورٹ پر مجھے ہیروئن اسمگلر بنا کر تلاشی نہ لیں۔ پنجاب پولیس میرے اہل خانہ سمیت مجھے بے قصور بھیڑ بکری کی طرح تھانے میں جوتے نہ مارے، رشوت......''

''لیعف اینڈ فاتلی اپنا اصل ملک ٹوٹی جوتی کی طرح چھوڑ کر کوئی شخص دوسرے ملک کا وفادار کیسے ہو سکتا ہے؟''

''بالکل ہو سکتا ہے آفیسر! ہماری وفاداری کے بغیر برطانیہ کے تخت کا سورج ڈوب تو کیا برطانیہ سمیت باہر طلوع بھی نہیں ہو سکتا، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہماری وجہ سے بے ثمر غدر بن گئی تھی۔ دوسری ورلڈ وار میں برما کی دلدل، افریقہ کے تپتے صحرا اور دنیا کے چپے چپے پر ہم بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہوئے، چیتے کی طرح لڑے اور نازیوں کے گنڈیریوں کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ سرحد، پنجاب، بنگال کے سپوت نہ ہوتے تو ہٹلر گریٹ بریٹن کی گردن چوزے کی طرح مروڑ پھینکتا۔''

''تھینک یو اینڈ کانگریچولیشنز۔ آج کے بعد آپ آزاد امریکہ کے ریسپیکٹ ایبل شہری ہیں اور آپ کا پاسپورٹ سفارتی F-16 ہے جو دنیا کے کسی کونے میں رد نہیں کیا جا سکتا۔''

''جسٹ لائک دا سکستھ فلیٹ آفیسر۔''

''اپنے تمام خوابوں کے کانٹوں کو حقیقت کے گلاب بنا کر تقدیر سے اپنے سب آئیڈیل چھین کر بھی تم اداس

ہو۔ کہیں پھر اسی وہم کی قید میں تو نہیں آ گئے کہ لوگوں کی بکواس بمو جب تمہاری وائف گیس لیکج سے نہیں مری بلکہ ہماری شادی کی خبر سن کر اور اپنے ڈائی وورس پیپرز کو آگ لگا کر جل مری تھی۔"

"میں ایسا ایڈیٹ نہیں کہ ایسی شٹ پر یقین کرتا پھروں!"

"پھر کیا ہے دیٹ یور مدر کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے اور وہ سڑکوں پر بیٹھ کر لوگوں سے کہہ رہی ہے کہ میرا چاند ایسا نہیں کہ وہ بیوی کی میت کو کندھا دینے بھی نہ آئے، جہاز خراب ہو گیا ہے آتا ہی ہوگا اور جب بچے کہتے ہیں یقیناً آئے گا تمہیں چار نمبر کی بس میں بٹھانے، تب وہ پتھر اٹھائے ان کے پیچھے بھاگتی ہے۔"

"انجلا پلیز۔" اس نے بوتل رکھ کر سگریٹ اٹھائے۔

"پھر مسئلہ کیا ہے؟" انجلا نے بیزاری اور اکتاہٹ سے پوچھا۔

"آج ہی کے لیے اپنا گھربار، وطن شیشم کے درخت، پیپل کی چھاؤں چھوڑی، لاء گریجویٹ ہو کر بھی پاگل خانوں کے ٹائلٹ صاف کیے۔ جب منفی ٹمپریچر میں گرتی برف کی ٹھنڈی آگ میں پیٹرول بھرتا ہوں تو ہیٹڈ کاروں میں بیٹھے کتے مجھے اپنے سے زیادہ خوش نصیب لگتے ہیں۔ مذہب بدلنا تو کوئی بات نہیں۔ سب مذہبوں کا ایک ہی مقصد ہے۔ کاسمیٹک سرجری سے اپنا براؤن چہرہ بلیچ سے زیادہ گورا کر لیا۔ ٹوبی شارٹ میں نے ہاتھوں سے تقدیر تو بدل لی مگر ایک چیز میں تو کیا میرا خدا بھی نہیں بدل سکتا۔" اس نے سگریٹ سے سگریٹ سلگایا۔

"مجھے بتاؤ وہ کون سا نیا گرا فال ہے جس کا رخ نہیں بدل سکتا۔ نہ یہ دنیا شیکسپیئر کے قول کے مطابق اسٹیج ہے جہاں انسان ایکٹر ہیں۔ یہ تو منڈی ہے رسل۔ مارکیٹ ہے۔ پیار، محبت، شہرت، شرافت، شرم دھرم، انصاف، عدالت، تعلیم، آنسو، مسکراہٹیں جو جی چاہتا ہے خرید لو۔ بس کسی کی قیمت کم کسی کی زیادہ۔ بولو وہ کیا ہے؟"

"پرامس کرو کہ بری حالت زار کا تمسخر تو نہیں اڑاؤ گی۔"

"بہت آک ورڈ ہے، شرم آتی ہے۔ مصیبت ہے رلدو خان پیراں ہوتا۔"

"وہاٹ؟ میں نے انڈر سٹینڈ نہیں کیا۔"

"میرے ڈیڈی کا نام ہے۔"

پھر کیا ہوا؟"

"اگر کسی نے پوچھ لیا تو میں کس کنوئیں میں ڈوب مروں گا۔"

"بس یہی پرابلم تھا؟"

"ہاں، ہاں۔"

"بی ایزی دین۔ وہ وقت بھی کبھی نہیں آئے گا، کوئی نہیں پوچھے گا۔"

"کیوں نہیں پوچھے گا؟"

"یہ امریکہ ہے، یہاں باپ کا نام پوچھنے کا رواج ہی نہیں!"

❁❁

Address: 23 Qasim Road Bahawalnagar : 62300 (Punjab)

مطالعے اور جائزے

کتاب : حمید سہروردی کے افسانے ایک تجزیاتی مطالعہ	مصنف : غضنفر اقبال
صفحات : ۲۷۶	قیمت : ۳۵۰ روپے
ناشر : کاغذ پبلشرز، گلبرگ	مُبصّر : طاہر نقوی

حمید سہروردی کا شمار سینئر اور معروف افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ برصغیر کے اہم ادبی رسائل میں ان کے افسانے چھپ چکے ہیں۔ ان سے میرا رابطہ ۹۰ کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں ہوا جب میں نے اپنا ادبی رسالہ ''رجحان'' شائع کیا تھا۔ اس کے محض دو شمارے شائع ہو پائے۔ پھر بوجوہ میں اسے جاری نہ رکھ سکا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ادبی پرچوں کے ساتھ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ حمید سہروردی کے صاحب زادے ڈاکٹر غضنفر اقبال نے ان کے اہم اور منتخب افسانے تجزیوں سمیت اب کتابی شکل میں شائع کیے ہیں اس کتاب کی افادیت یہ ہے کہ حمید سہروردی کی افسانہ نگاری اور افسانوں کی اہمیت بھرپور انداز میں سامنے آتی ہے۔ اس میں ۱۹ افسانوں کا تجزیہ مستند نقادوں نے تخلیقی لب ولہجے میں کیا ہے۔ ان میں عصمت جاوید، حامدی کاشمیری، عتیق اللہ، مہدی جعفر، سلیم شہزاد، بیگ احساس، م۔ ناگ، ارتکاز افضل اور خود ڈاکٹر غضنفر اقبال شامل ہیں۔ یہ وہ نقاد ہیں جو افسانے کی تہہ داری سمجھتے ہیں۔ اگر دو تین افسانوں کا تجزیہ پاکستان سے بھی کرا لیا جاتا تو شاید اس کتاب کی جامعیت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ تاہم ان تجزیوں سے حمید سہروردی کے افسانوں کے نئے نئے در کھلتے ہیں اور ان کی افسانہ نگاری کے مختلف زاویے نئے انداز سے سامنے آتے ہیں۔ اکثر نقاد کسی افسانے کی ایسی تفہیم کرتے ہیں جس سے خود اس کا تخلیق کار ناواقف ہوتا ہے۔ دراصل نقاد ہی افسانہ نگار کی پہچان بناتا ہے۔ اس لیے تخلیقی ادب میں جینوین نقاد کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوتی۔ کتاب کی ابتدا میں ڈاکٹر غضنفر اقبال نے حمید سہروردی کے فن پر اپنی رائے دی ہے۔ اس رائے سے خود غضنفر اقبال کی تنقیدی اپج کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ عارف خورشید نے ''وہ ایک افسانہ طراز'' کے عنوان سے حمید سہروردی کی افسانہ نگاری اور شخصیت پر مجموعی طور سے گفتگو کی ہے۔ فرید احمد نے شخصیت کا تعارف نامہ ترتیب دیا ہے۔ یوں اس کتاب میں زیر گفتگو افسانہ نگار کے متعلق کافی معلومات مل جاتی ہیں۔ البتہ منظروں سے ڈوبتی اُبھرتی کہانی۔ ''عقب کا دروازہ، کربلا بہت دور ہے، سمندر۔ کہانی در کہانی، کھوئے ہوئے راستوں کی شب نہیں کا سلسلہ ہاں سے، کرسی میں دھنسا ہوا آدمی، بے شناخت ایسے افسانے ہیں جو حمید سہروردی کا تفصیلی تعارف ہیں۔ وہ کچھ اور نہ لکھتے تب بھی ان افسانوں کے

حوالے سے افسانے کے میدان میں موجود رہتے۔ یہ ان کا اضافی وصف ہے۔

ڈاکٹر غضنفر اقبال، حمید سہروردی کے لائق فرزند ہیں۔ خود افسانہ نگار اور نقاد کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے زیرِ نظر کتاب کو ترتیب دے کر نہ صرف اپنے والد سے فرمانبرداری کا ثبوت دیا ہے بلکہ اُردو ادب کے لیے اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب آرائش اور پیش کش میں سلیقہ نظر آتا ہے۔ یہ اضافی وصف ہے۔ اس کی داد ملنی چاہیے۔

کتاب : نامعلوم (شعری مجموعہ)	مصنف : صابر ظفر
صفحات : ۱۴۴	قیمت : ۱۴۰ روپے
ناشر : دستاویز مطبوعات، دکیپت روڈ، لاہور	مُبصر : سحر علی

صابر ظفر شعر و ادب کی دنیا کا ایک ایسا شناور ہے جس کی یاوری قسمت نے ہمیشہ کی ہے۔ اس سچے اور کھرے شاعر پر شاعری کی دیوی دل و جان سے مہربان رہی ہے۔ پندرہ خوب صورت شعری مجموعوں کے خالق صابر ظفر کو ان کی تازہ کتاب کی اشاعت پر بے شمار لوگوں کا پیار اور انجمنوں کی پذیرائی ملی ہو تو حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ صابر ظفر اپنے عہد سے جڑا ہوا ایسا شاعر ہے جو جدید حسیت اور عصری شعور سے قدم ملا کر چلنے کا خواہش مند ہے اور وہ اپنی اس پیش رفت سے مطمئن بھی ہے، صابر ظفر نے بے شمار نظمیں اور غزلیں کہی ہوں گی اور بہت ہی خوب صورت گیت لکھے ہوں گے پذیرائی بھی ملی ہوگی عالمی شہرت بھی، ان کی غزلوں کے البم اور گیتوں کے کیسٹس نے پائی ہوگی لیکن وہ اپنی ذات سے بے گانہ نظر آتے ہیں۔ بہت کریدنے پر کچھ بتاتے ہیں مگر فخر نہیں کرتے، مقبولیت پسند نہیں رہے کبھی وہ، بہت کم شعراء کے یہاں یہ بے نیازی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی شاعری میں جذبوں کو اسیر کر لینے والی نرم و گداز دھیمی دھیمی آنچ موجود ہے اور کہیں دل میں اُتر جانے والا ان کے شعروں کا تیکھا انداز آپ کے دامن دل کو پکڑ لیتا ہے، اس کے علاوہ اپنے اطراف میں رنج و غم اور درد والم کو محسوس کرنے والا صابر ظفر اپنے اندرون میں بھی بہت سے عذاب رکھتا ہے۔ مگر کسی سے ملتے ہوئے اپنے لبوں پر سجے ہلکے سے تبسم کو مٹنے نہیں دیتا!

صابر ظفر کی شاعری انسانی فکر پر حیرتوں کے در کھولتی ہے۔ یہ بڑا کمال ہے اس وقت میرے ہاتھوں میں ان کا شعری مجموعہ ''نامعلوم'' ہے، جو صرف غزلوں پر مشتمل ہے، میں جوں جوں صفحہ پلٹتی ہوں، شعر پڑھتی ہوں، تخلیق کی ایک ماورائی دنیا منکشف ہوتی ہے۔ پہلے آسمان پھر اس جہاں سے اس جہاں تک زمان و مکان کی قید سے پرے رنگ نور خوشبو اور روشنی کا سفر طے کرتی ہوں اور ایک عجیب سی سرشاری اور کیف میں ڈوب جاتی ہوں۔ جانے کون سے خوابوں کے در آنکھوں پر وا ہوتے جاتے ہیں کئی شعر اپنے اندر ایک جہان معنی لیے ہوئے محسوس

ہوتا ہے۔

وجود کیا ہے عدم کیا ہے کچھ نہ تھا معلوم
میں رو برو تھا کسی کے تھا کیا معلوم
ازل سے پہلے تھا کیا اور ابد ہے کیا
یہ معجزہ ہی ہوگا اگر ہوا معلوم

نامعلوم کے اس سفر میں صابر ظفر بہت عرصے بعد خود کو تلاش کرتے ہوئے آ نکلے ہیں اور حیران کہ کیا دیکھیں اور کیا نہ دیکھیں، سراسیمہ سے نظر آتے ہیں، یقین وگماں اور معلوم ونامعلوم کے درمیان کا سرا ڈھونڈ رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اب سمجھ میں آیا کہ آئندہ کراچی کے پچاس شماروں میں کیوں مسلسل حاضری دی ہے۔ یہیں پر خالق اور مدیر کے رشتے کی معنویت بھی واضح ہوئی۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے جسے یاد رکھنا ضروری ہے۔
بہر حال یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ صابر ظفر کی ''نامعلوم'' کی دنیا میں داخل ہونے کے لیے آپ کا ذہن کی گزر گاہوں کا کھلا رکھنا ضروری ہے کہ ہم کلامی آپ کو اپنی کیفیت میں تادیر رکھے۔

کتاب : زوال سے پہلے
مصنف : شمیم منظر
صفحات : ۱۹۲
قیمت : ۲۰۰روپے
ناشر : میڈیا گرافکس، کراچی
مبصر : سائرہ غلام نبی

ہم دیکھتے ہیں کہ معاشی عالمگیری نظام میں، خیال ہو، تصور ہو آرٹ یا پھر آئیڈیالوجی یا کوئی بھی سیاسی ایجنڈا، فقط اس کی حیثیت پراڈکٹ کی ہوتی ہے۔ فکر تازہ کی کوئی لہر مارکیٹ اکانومی میں آتی ہے۔ اور ہاتھوں ہاتھ بکنے لگتی ہے۔ بیچنے اور خریدنے والے جملہ مفادات حاصل کر کے، فرد کو سوسائٹی میں تنہا کر کے، اس کے دُکھوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلے میں اُلجھا دیتے ہیں۔
شمیم منظر نے اپنے ناول ''زوال سے پہلے'' میں، جو دور عروج تھا، ترقی پسندی کا، کی نظریاتی اساس پر اپنے قصے کے پلاٹ کی تعمیر کی ہے اور سوچ وفکر سوالیہ واشاریہ دھیرے دھیرے قصے میں دائرے کی تشکیل کرتے ہیں کہ ترقی پسندی نے نظریاتی طور پر فرسودہ روایتوں میں خلط ملط ہوئی سوسائٹی کو کیا دیا؟ اور اس نظریہ میں ایندھن کی طرح جھونک دیے جانے والے فرد سے کیا کچھ لے لیا۔ جب کہ وجودیت کے مقبول ترین تصور میں بھی فرد کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ ان ہی تضادات کی کچھ جھلک شمیم منظر کے ناول ''زوال سے پہلے'' کے اوراق پر نمایاں ہوتی ہے۔ نظریاتی اساس پر مبنی ایک رومانی قصے کی بنت سے یہ ناول پہلے صفحے سے قاری کی توجہ حاصل کر لیتا ہے۔
اس ناول میں شاہد نظریاتی رجحان کے تحت اپنی کرداری شناخت کے حوالے سے مرکزی اہمیت حاصل کرتا ہے۔ وہ آئیڈیلزم سے زندگی کی شروعات کرتا ہے۔ اور آنکھ سے خواب کا جھوٹا رشتہ استوار کر کے، اسی کو کل حقیقت

جان کراس میں زندگی کرنے کے خیال کو راسخ کر لیتا ہے، رفتہ رفتہ انسانی تجربات سے تمام منظر نامہ واضح ہونے لگتا ہے اور یہاں تک کہ وہ سماج سے سمٹتا ہوا محض فرد رہ جاتا ہے۔ یہاں حیران کن تنہائی اس کا مقدر ہوتی ہے اور وہ اپنے وجود کو جھیلتا رہ جاتا ہے۔

قصہ کے عروج پر یہ کردار تنہا رہ جاتا ہے۔ معاشرتی کرب ناک حقیقتیں اسے کرچی کرچی کر دیتی ہیں۔ اور شکستگی اس کے اعصاب کو مضمحل کر دیتی ہے۔ پھر بھی منفی سوچ اس کے تصورات کو پراگندہ نہیں کرتی۔ وہ زندگی کرنے کے لیے حوصلہ مند آرزوئیں دل میں رکھتا ہے۔

مگر کب تک......؟ وہ سماج سے فرد اور فرد سے لاش میں تبدیل ہونے میں اسے بہت زیادہ وقت نہیں لگتا۔ اور سفاک وقت، بہت جلد، نظریاتی موت کا اعلان نامہ ہاتھ میں تھما دیتا ہے، اور یہی اس ناول کا نقطہ ارتکاز ہے۔

شمیم منظر نے واقعات کینویس پر پھیلانے کی بجائے قصے کو سمیٹ کر چند کرداروں میں کہانی کے پلاٹ کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ خوش سلیقگی سے ناول نگار نے نظریاتی توڑ پھوڑ اور سیاسی کشمکش کو موضوع کے دائرے سے باہر نہیں ہونے دیا۔ اور یہ مشاقی اور مربوط ذہنی، مصنف کے ذہانت کی دین ہے۔ جو ناول میں نمایاں ہوتی ہے۔ دو سو صفحات کے اس ناول میں، قاری قصے اور موضوعی فکر سے جڑا ضرور رہتا ہے، اور ہر صفحے پر ایک نئے سوالیے کا سامنا بھی کرتا ہے۔ یہی بات اس ناول کو اہم بناتی ہے۔

کتاب : تمہارے غم کے موسم میں	مصنف : سحر علی
صفحات : ۱۶۰	قیمت :
ناشر : دنیائے ادب کراچی	مُبصر : سائرہ غلام نبی

سحر علی شعر و سخن کی شاہراہ پر قدم تو اوّلین عمر سے ہی رکھ چکی تھیں۔ زندگی کے معمولات اور کار دنیا ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور ابھی نو عمری پختگی میں ڈھلی بھی نہ تھی کہ ان کے رفیقِ حیات نے اپنا سفر تمام کیا اور زندگی سے کنارہ کرتے ہوئے شہر خموشاں کی راہ لی۔ سحر نے اس موڑ پر اس دائمی جدائی کے دُکھ کو اوڑھ لینے کے بجائے ایک نیا حوصلہ نئے سرے سے تھاما اور جینے کی راہ پر خود کو ڈال دیا۔ مگر یہیں سے ان کی شاعری میں کیفیت ہجر، ملال آمیز رنگ میں ابھری اور ان کے پہلے مجموعہ ''تمہارے غم کے موسم میں'' کا لہجہ بنا گئی۔

اس مجموعے میں حزنیہ لب و لہجہ دکھتے ہوئے احساس کی ایک فضا بنا رہا ہے۔ کڑی دھوپ میں آسمان تلے بے اماں لڑکی کا احوال کہہ رہا ہے۔

اپنے سائے سمیٹ کر چپ چاپ   میرے آنگن سے اڑ گیا بادل

اور پھر یہ اشعار دیکھیے۔

کھیل ہوتی نہیں تیرگی رات کی
میں نے کاٹی ہے جو زندگی رات کی
کوئی جیسے ہی نظروں سے اوجھل ہوا
بجھ گئی ناگہاں روشنی رات کی

بہت ممکن تھا کہ سحر علی کی شاعری محض ذات کے غم کا نوحہ بن کر رہ جاتی مگر ''تمہارے غم کے موسم میں'' کے ورق در ورق اُلٹتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زیر تبصرہ مجموعے کی شاعرہ اپنے ذاتی دکھ اور غم سے ہٹ کر بھی معاملات دنیا اور معمولات صبح و شام کی خبر رکھتی ہے اور کھلے تضادات اور منافقانہ رویّوں کی دکھن و چبھن کو محسوس کرتی ہے۔

ہمارے زخم اس کے ہاتھ سے اچھے تو کیا ہوں گے
مرض کچھ اور بڑھ جاتا ہے جب مرہم بدلتا ہے

پھر اس طور کے اشعار بھی ان کی غزلوں میں آتے ہیں۔

مجھ سے پوچھتے کیا ہو پڑھ کے دیکھ لو خود ہی
کیا لکھا نہیں ہوتا آدمی کے چہرے میں
کب چھپائے چھپتا ہے کرب زندگانی کا
دکھ بھرا ہوا دیکھا خوش دلی کے چہرے میں

سحر علی کی شاعری میں جدائی کے پہلو بہ پہلو زندگی کے اور رنگ بھی کھلتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ کہیں محبتیں اپنی جذب دل کی حکائتیں کہہ رہی ہیں تو کہیں خواہشوں کے دیے جل رہے ہیں۔ سحر علی کے یہ اشعار دیکھیے۔

اک ترے نہ ہونے سے موسم بہاراں میں
خار بن کے چبھتی ہے پھول کی نمائش بھی
پہلے ہی ستم کب تھے کم وفا کی راہوں میں
اور اب کریں گے وہ دل کی آزمائش بھی

علاوہ ازیں سحر علی کی شاعری میں نسائیت کا احساس جا بجا ملتا ہے۔ وہ اپنی صنف کی نمائندگی پورے شعور کے ساتھ کرتی ہیں۔ نہ صرف نسائی جذبوں سے آشنا ہیں بلکہ نسائیت کو درپیش مسائل سے بھی درک رکھتی ہیں۔ وہ اُلجھنیں، وہ معاملات جو گھر میں اور گھر سے باہر کی دنیا میں ایک عورت کو پیش آتے رہتے ہیں۔ وہ ان پر پہروں سوچتی ہیں اور پھر ان کو اپنے اشعار میں مضمون کرتی ہیں۔ ''لکھاری عورتیں'' سے یہ ٹکڑا دیکھیے۔

یہ زبانی تحفظ کا نعرہ مگر
کیا ہم آواز و دم ساز ہوگا کبھی
کیونکہ پھر دوسرے روز ہی
غم کا سورج کہیں

کسی شہناز پر
کسی پروین پر
زخم سے آگ سے
دُکھ کے ہر باب سے
روز بن لیتا ہے
اک کہانی نئی
اور تیزی سے لکھنے میں لگ جاتی ہیں
اپنے اطراف پھیلی ہوئی صورتیں
یہ لکھاری مرے عہد کی عورتیں

کتاب : جرأت رندانہ	مصنف : آمنہ مفتی
صفحات :	قیمت : ۲۵۰روپے
ناشر : قوسین 15۔سرکلر روڈ لاہور	مُبصر : سائرہ غلام نبی

آمنہ مفتی کے کچھ افسانے پڑھنے کے بعد، ان کا ناول ''جرأت رندانہ'' ہاتھ میں آیا۔ان کے افسانوں نے حیران کن قوتِ مشاہدہ اور تجزیاتی ہنر کاری اور بنت سے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔اسی توقع کے ساتھ ان کے پہلے ناول ''جرأت رندانہ'' کا مطالعہ شروع کیا۔

اس ناول کی کہانی کا آغاز شہر سے گاؤں کی طرف جاتے ہوئے رستے سے ہوتا ہے۔منیر کا یہ معمول کا سفر، ایک نئے سفر کا آغاز ہے۔آج سے اسے ایک نئی زندگی جینا ہے کہ گاؤں میں اس کے والد کا جنازہ رکھا ہے۔منیر جو پولیو کا شکار ہے۔اسی طرح اس کی بہن شہلا ہے۔جو شہر میں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

اس ناول کی کہانی کا گرداب یہاں سے پھیلنا شروع ہوتا ہے اور اس دائرے میں سماجی معمولات، معاش کی کشاکش، روایات کی شکستگی اور کہیں کہیں سیاسی تبدیلیوں کی جھلکیاں ایک مکمل منظرنامے کی تشکیل کرتی ہیں۔

شہلا ایک متحرک کردار ہے اور اس کردار کے حوالے سے بہت سے کردار اپنی شناخت کرواتے ہیں۔طوبیٰ، فرح، عظمانہ وغیرہ۔

آمنہ مفتی انتہائی زیرک نگہی سے شخصی تجزیہ کرتے ہوئے بہت معمولی اور سامنے کی بات سے وہ بات چن لیتی ہیں، جو معنی خیزیت سے بھرپور ہوتی ہے۔شہلا کے کردار کے حوالے سے یہ پیراگراف دیکھیے۔جس سے اس کے کردار کی تعمیری جھلک نمایاں ہو رہی ہے۔

''تم شام کو مشاعرہ اٹینڈ کرو گی؟'' طوبیٰ نے شہلا سے پوچھا۔
''ہاں، اگر تم لوگ کرو گی تو میں بھی کروں گی، ورنہ میں کیا کروں گی، اتنی مشکل اُردو تو بالکل بھی میرے پلے نہیں پڑتی۔'' شہلا نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔
''ہم......'' معظمانہ اپنے کسی دھیان سے چونک کر دیکھنے لگی۔
کتنے دکھ کی بات تھی وہ جھوٹی Snobery دکھانے کے لیے، اپنے آپ کو ان لڑکیوں کے سامنے ادب سے بالکل بے بہرہ ثابت کر رہی تھی۔ حالانکہ چھوٹے شہروں کے چھوٹے اسکولوں سے پڑھی ہوئی معمولی لڑکیوں کی طرح اسے بھی شاعری اور خصوصاً عشقیہ شاعری۔ انتہاؤں کی حد تک، اور دل میں اُتر جانے کی حد تک، پسند تھی۔''
اسی کامپلیکس کے ساتھ ناول کا پلاٹ واضح ہوتا ہے اور مختلف تضادات کو اُبھارتا ہوا طنزیہ صورتِ حال کو نمایاں کرتا ہے پھر ایک مرحلے پر یہ فیصلہ کن موڑ آتا ہے اور زندگی کے تسلسل میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ:
''حلیف بدلے جاسکتے ہیں، قرن بدل جاتے ہیں، طریقہ کار بدل جاتے ہیں میدان بدل جاتے ہیں۔ مگر جنگیں جاری رہتی ہیں۔''
آمنہ مفتی کے اس پہلے ناول میں ان کی تخلیقی نثر ان کے بیانیے کو ایک کلاسیکی رچاؤ عطا کرتی ہے۔
بے رحم تجزیہ اور تند و تیز مکالمہ، زندگی سے پیوست مکمل سچائی، اس ناول کی اہم خوبیاں ہیں۔ اس ناول کا قاری کسی بھی لمحہ کسی بھی سطر پر مایوس نہ ہوگا۔

کتاب : میں دہشت گرد ہوں	مصنف : محسنہ جیلانی
صفحات : ۱۱۱	قیمت : ۱۲۰ روپے
ناشر : شہرزاد، بی ۱۵۵، بلاک، گلشن اقبال، کراچی	مُبصر : محمود واجد

کوئی ۲۲ سطروں کے ۸۴ صفحوں پر مشتمل برطانیہ میں مقیم فکشن لکھنے والی محسنہ جیلانی کا ناولٹ ''میں دہشت گرد ہوں'' افسانہ نگار آصف فرخی کے ادارے شہرزاد کراچی نے شائع کیا ہے اور مجھے اسے پڑھ کر اپنا تاثر پیش کرنے کی دعوت دی تو مجھے سب کچھ جانا پہچانا لگا کہ پیش لفظ بھی اپنے بااثر فکشن لکھنے والے برطانیہ میں مقیم کرم فرما جناب قیصر تمکین نے لکھا ہے۔ بے حد گہری سوچ کے لوگ اپنی تحریر میں ایمان دار ہوتے ہوئے بھی ایک منفرد رائے رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، سو یہاں بھی وہ صاف پہچانے جاتے ہیں۔ قیصر تمکین کہتے ہیں:
''مغرب کے قلم کاروں کی محفل میں ایک خوش آئند جھونکے کی طرح خیر مقدم کیا جائے گا۔''
مجھے نہیں پتہ بات کہاں آکر ٹھہری۔ یہ مسودہ (اگر میں بھول نہیں رہا کہ یادیں اب ساتھ نہیں دیتیں) یہ ناولٹ پہلے میرے پاس آیا تھا مگر ''آئندہ'' کے محدود وسائل میں ممکن نہ تھا کہ میں خود شائع کرتا یا ''آئندہ'' کا بڑا

حصہ وقف کرتا، سواب چھپ کر آ گیا ہے۔ جی خوش ہوا کہ موضوعی اعتبار سے باہر کی دنیا میں مقیم ایشیائی لوگوں کے مسائل میں بعض بڑے گمبھیر ہیں جسے نہایت خوش اسلوبی سے برتا گیا ہے اور رواں انداز میں بھی۔ اب دیکھنے کی دو باتیں ہیں۔ برصغیر پاک و ہند سے باہر رہنے والی نسلیں کیا بڑی افتاد میں مبتلا ہیں یا گرتے پڑتے نئے ماحول میں انہوں نے جینا سیکھ لیا ہے اور اب اعتبار سے فیصلہ کرنے کی منزلوں میں رواں دواں ہیں۔ قیصر تمکین کی وہ بات مجھے اچھی اور زیادہ بامعنی لگی، جو انہوں نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا: ''میں نے اپنے بچوں کو بتا دیا ہے کہ میرے بعد میری کتابوں کا کیا کرنا ہے۔'' میں خوامخواہ اس فکر میں مبتلا تھا کہ اقامتی ملک اس تبدیلی کی زد میں آئی ہوئی نسل کو قبول کرتی ہے یا نہیں۔

مصنفہ محسنہ جیلانی کافی بالغ نظر ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ ذرا بھی بد دل نہیں ہوتی ہیں اور اس (تبدیلیٔ فکر) کو معمول کا حصہ سمجھتی ہیں۔ بلکہ پتے کی بات بھی کیا دکھائی ہے کہ زخم بھی اپنوں ہی کے ہاتھوں ملتا ہے اور مرہم بھی کسی اور سے نہیں بلکہ خود اپنی تعمیری سوچ سے برآمد ہوتا ہے۔ اس موضوع پر لکھی جانی والی تخلیقات میں محسنہ جیلانی کا نام اعتماد سے لیا جائے گا۔ مجھے یقین ہے۔

باہر کی دنیا میں **Literature of Immigrants** ایک الگ صنف کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں کسی نہ کسی حوالے سے یہ تصنیف یاد رکھی جائے گی۔

اس کتاب بلکہ مجموعہ میں ناول ناولٹ کے علاوہ دو افسانے بھی شامل ہیں، جو اس جڑواں تصنیف کو ایک اور رُخ بھی دیتے ہیں۔ کیا فکشن کی یہ پیش کش (میری ایک سی دلچسپی کو **multi dimensional** بنا سکے گی) یہ مرحلہ آگے کا ہے۔

''کائنات بانہوں میں'' اور ''عراق عراق'' نام کے افسانے بہت کچھ پہلے ہی نہیں کہہ دیتے پھر فکشنلائز کیا ہوا۔ لیکن یہ ایک الگ بات ہے کہ دل گدازی یہاں بھی ہے اور وہاں بھی۔ اسے ان کی اہمیت میں اضافے کا سبب بھی بنایا جا سکتا ہے اگر ان کے فکشن لکھنے کے پسِ منظر کو وسیع تناظر میں لے جا کر دیکھا جا سکے تو پھر عراق عراق نہیں (ملک نہیں) پسِ منظر بن جاتا ہے، جہاں دوسری گزرگاہیں بھی آ ملیں گی۔ بات دراصل نیتوں اور ترجیحات کی ہوتی ہے۔ پھر لکھنے والے یا فنکار کا کمٹ منٹ موضوع کو کہیں کہیں لے جا سکتا ہے۔ سو ہمیں جینوین لکھنے والوں کو کھل کر اور کئی قسطوں میں اپنی بات کہنے کی سہولت بھی فراہم کرنی چاہیے اور تنقید کی جلدی میں تصنیف کے خلوص کو آزمانے کا مناسب موقعہ اور وقت کا انتظار کرنا چاہیے تا کہ جلدی بازی میں کیے گئے فیصلے کو نظر ثانی کی زحمتوں سے بچایا جائے کہ یہی معروضی صورتِ حال کا تقاضا بھی ہے۔

خاص بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ ''میں دہشت گرد ہوں'' کا اصرار دراصل فکشن کی نئی نسل کو اپنے ہونے کے احساس کا اقرار ترجیحاً بھی اچھا لگتا ہے اور اس کی قدر ہونی چاہیے کہ اثبات بہر حال نفی کے آگے کی منزل ہے۔

محبتیں اور شکایتیں

آئندہ کا شمارہ نمبر ۴۸ موصول ہوا۔ شکر گزار ہوں۔

غزلیں پڑھ کر اندازہ ہوا کہ یہ صنفِ سخن کساد بازاری کا شکار ہے۔ حسن رضا عباس نے ردیفیں بھی نکالی ہیں اور شعر بھی عمدہ کہے ہیں جس سے ان کی مشاقی کا انداز ہوتا ہے۔ محمد علوی کی شاعری پر بیدار بخت کا مضمون خوب ہے انہوں نے محمد علوی کی شاعری کا بہت پُر خیال تجزیہ کیا ہے۔ اسی طرح زاہدہ حنا نے بھی قرۃ العین حیدر کے افکار ونظریات پر بہترین مضمون لکھا ہے۔

افسانہ صرف ایک ہے اور وہ ہے حبیب حق کا ''ماموں جان'' دیگر افسانے بھی اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہی ہیں۔ سائرہ جی کی یہ بات بالکل درست ہے کہ ہمارا فکشن ابھی لایعنیت کا شکار نہیں ہوا ہے حالانکہ ماضی قریب میں اس کی بھرپور کوشش کی جاچکی ہے۔

نامی انصاری
(79/295 Nala Road, Chamanganj, Kanpur : 208002)

تازہ افسانہ ''لختِ جگر'' ارسال کر رہا ہوں ''آئندہ'' کے معیار پر پورا اُترتا ہو تو قریبی اشاعت میں جگہ دے کر ممنون فرمائیں۔ چار سال بعد حاضری دی ہے۔

احسان بن مجید
(Pasha Petroleum Service College Road, Attock)

''آئندہ'' کا ایک شمارہ مجھے تہواری میں ارمان نجمی نے پٹنہ سے ارسال کیا تھا۔ چند روز قبل میں منظر شہاب صاحب کے یہاں گیا تھا، وہ بھی مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ ''آئندہ'' کا شمارہ آیا یا نہیں۔

میں اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں بہت مشغول رہا۔ اس لیے آپ سے کوئی رابطہ بھی نہیں کر سکا۔

آپ کا ایک مکتوب گرامی بہت پہلے موصول ہوا تھا۔ اس کے بعد ساغر برنی کے ذریعہ ایک مکتوب نامہ ملا تھا۔

اگر ''آئندہ'' کا جنوری فروری مارچ ۲۰۰۸ء کا شمارہ آپ نے نجمی صاحب کو بھجوایا تو ان کو کہیے کہ فوراً مجھے ارسال کر دیں۔

منظر شہاب کی کتاب ''زخمی پرندے کی صدا'' چھپ چکی ہے آپ کو خبر ہوگی۔ حالات ایسے ہیں کہ یہاں سے کتاب بھیجنے میں خدشہ رہتا ہے۔ میں اپنے ایک عزیز کے ذریعہ اپنی کتاب ''بے کنار'' آپ کی خدمت میں بھجوا رہا ہوں۔ نئی تخلیقات بھی انشاء اللہ بھجوادوں گا۔

احمد عظیم میرے بڑے پیارے دوست ہیں وہ مسقط میں تھے۔ ان سے کہہ کر میں ان کو اپنی کتاب بھجوا رہا ہوں۔

اب وہ نہیں ہیں، شاید Heart Attack تھا۔ آج اُن کا سوئم ہے۔ (ادارہ)

شمس فریدی
(Mohd, House G, S. Road, Jamshed Pur 831006 India)

آپ کی بیمار پُرسی سے ہماری دل کی تکلیف جاتی رہی۔ اللہ کریم آپ کو خوش رکھے۔

آپ نے اداریہ میں اور سائرہ غلام نبی نے ''دوسرا صفحہ'' میں قاری کی تخلیقی بصیرت کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ سنجیدہ اور فکری تخلیق کا قاری ہر دور میں موجود رہا ہے۔ سنجیدہ ادب کے مطالعے کا انجذاب قاری کے اندر ایک ایسا خود کار نظام جاری کر دیتا ہے کہ قاری کسی بھی فن پارے کی تخلیقی رفعت کو پرکھنے کی مکمل صلاحیت سے بہرہ مند ہو جاتا ہے اور بہ قول سائرہ غلام نبی تخلیق اگر مختلف موضوعی و معنوی دائروں کو سمیٹنے سے قاصر ہو تو قاری محض آرائشی یا مشاطگی سے نہیں بہلتا۔

''آئندہ'' نے اپنی تخلیقی قد و قامت پر آنچ نہیں آنے دی۔ آپ کے مکتوباتی حصے کا اختصار اس کی جامعیت اور پہچان ہے۔ افسانے سارے خوب ہیں لیکن طاہر نقوی کا ''موسم'' کمال ہے۔ عتیقہ ناز افسانہ تراشنے کا فن خوب جانتی ہیں لیکن ان کا فکاہیہ ''لک آنجن'' کوئی تاثر نہیں چھوڑ سکا۔ تحریر میں ارتکاز کی بجائے انتشار ہے۔ وہ موضوع کو نبھا نہیں پائیں۔ انگریزی اور سندھی کہانیوں کے نہ صرف تراجم رواں اور سلیس ہیں بلکہ کہانیوں نے بھی لطف دیا۔ ''بیدی کی کہانیوں کی عورت'' فاطمہ حسن کا ایک Informative اور جامع مضمون ہے جب کہ سائرہ غلام نبی نے ''مشفق خواجہ کی باقیات'' میں ان کی تحریروں سے جو اقتباسات کا چناؤ کیا ہے گویا زیور میں نگینے جڑے ہیں۔ مضمون میں اقتباسات قلم کار کی مطالعاتی وسعت اور انجذاب کا پتہ دیتے ہیں۔ اللہ آپ کو اور ''آئندہ'' کو سلامت رکھے۔

محمد حامد سراج
(Chashma Barraj, Mianwali : 42030)

''آئندہ'' ملتا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہر بار یاددہانی کا پروانہ بھی کہ آپ کو میری تخلیقات کا انتظار ہے۔
اس بار دو نظمیں، دو غزلیں، اور ایک نثری تحریر ''آئندہ'' کی تحویل میں دے رہا ہوں۔ اپنی رائے اور رسید سے مطلع فرمایئے گا۔ میری نئی کتاب ''بشارہ'' پاکستان اور ہندوستان دونوں جگہ چھپ رہی ہے۔
کچھ عرصہ قبل یعقوب تصور صاحب سے فون پر گفتگو کے دوران علم ہوا کہ ان دنوں آپ ابوظہبی میں موجود تھے۔ آپ سے ملے زمانہ ہو گیا۔ سفر کے منصوبے بناتا ہوں لیکن اللہ کی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ دیکھیے کب موقع ملتا ہے۔ سائرہ غلام نبی صاحبہ کو میرا سلام پہنچے۔

شاہین
(1328 Potter Drive Manotick, ON K4M 1C6, Canada)

پرکاش فکری صاحب ایک عرصہ سے بیمار تھے۔ لیکن ان کا انتقال اچانک ہوا ہے۔ انتقال سے پندرہ دنوں قبل مجھ سے فون پر باتیں ہوئی تھیں۔ سہ ماہی ''سربز'' ہماچل پردیش کے تازہ شمارے میں فکری صاحب پر گوشہ شائع ہوا تھا۔ کرشن کمار طور نے ان کی شاعری کی جو تعریفیں کی ہیں، اسے وہ غلو سے تعبیر کر رہے تھے۔

نسیم افضال مرحوم کے انتقال کی خبر سن کر بے حد غم زدہ ہے۔ لیکن افضال مرحوم جب رانچی میں اقامت پذیر تھے تو پرکاش فکری صاحب سے کافی قریب تھے۔

نجم عثمانی

(New Colony, Wasseypur, Dhanbad Jharkhand)

آپ کی خدمت میں فاروقی صاحب کا ہدایت کردہ مضمون بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ قریبی شمارے میں شائع فرمائیں گے۔ فاروقی صاحب آپ کو سلام لکھواتے ہیں۔

امین اختر

(313/317, Rani Mandi, P.O. Box 13, Allahabad)

''آئندہ'' کا شمارہ ۴۸ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء) ڈاکٹر طارق چھتاری کے توسط سے موصول ہوا۔ رسالہ ملتے ہی میں سب سے پہلے اداریہ پڑھتا ہوں، پھر قارئین کے خطوط پر نظر ڈالتا ہوں۔ اداریہ اس لیے کہ یہ رسالہ نکالنے والوں کی سوچ کا آئینہ دار ہوتا ہے، اور خطوط اس لیے کہ ان سے ان لوگوں کے خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے جن کے لیے رسالہ نکالا جاتا ہے۔

سائرہ غلام نبی صاحبہ نے اپنے اداریے میں مغرب کے حوالے سے ''تہذیبی تنہائی'' کی جو باتیں کہی ہے اور مشرق کے حوالے سے قدروں، کا جو ذکر کیا ہے وہ بہت درست تجزیہ ہے۔ بلاشبہ ہماری قدریں ہی ہمارا تہذیبی اثاثہ ہیں۔ ادب ان کی بھرپور عکاسی اور نمائندگی کرتا ہے۔

شمس فاروقی کے مضمون کے حوالے سے ڈاکٹر ارمان نجمی نے جو باتیں کہی ہیں وہ بڑی حد تک صحیح ہیں۔ شمالی ہند کا عوامی ادب (Folk literature) جس میں گیت یا لوک گیت (Folk songs) بھی شامل ہیں اُردو کا بھی اتنا ہی قیمتی ادبی و تہذیبی سرمایہ ہے جتنا کہ ہندی کا۔ اُردو گیتوں/لوک گیتوں پر تحقیقی نقطۂ نظر سے کافی کام ہوا ہے اور گیتوں کو جمع کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ اس ضمن میں اطہر علی فاروقی، بسم اللہ نیاز احمد اور قیصر جہاں کی کاوشیں لائقِ ستائش ہیں۔

جہاں تک ہندی کا تعلق ہے، ہندی اپنے عام اور وسیع مفہوم میں شمالی ہند کی ان تمام بولیوں (Dialects) کو اپنے دائرے میں سمیٹے ہوئے ہے جن کا ارتقا جدید ہند آریائی دور کے آغاز کے وقت (۱۰۰۰ سنہ عیسوی میں) شورسینی اَپ بھرنش اور اردھ، مگدھی اَپ بھرنش سے ہوا جن میں کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی، قنوجی،

اودھی، بگھیلی، چھتیس گڑھی اور راجستھانی شامل ہیں۔ بہاری بولیاں میتھلی، مگھی اور بھوج پوری بھی اسی ہندی میں شامل کرلی جاتی ہیں۔ یہ محض ہندی امپیریلزم کا نتیجہ ہے، ورنہ ان میں سے بیشتر بولیاں اپنی جداگانہ لسانی خصوصیات کی بنا پر زبانوں کا درجہ رکھتی ہیں۔

اپنے مخصوص معنی میں ہندی سے مراد کھڑی بولی ہندی ہے جو ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اور یہی زمانہ حال کی ہندی ہے۔ یہ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ اس کا آغاز فورٹ ولیم کالج سے ہوتا ہے۔ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ اہتمام کلکتے میں ۱۸۰۰ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کالج کے ایک عہدیدار ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی ہدایت پر للو جی لال (بھاکھا منشی) نے ۱۸۰۳ء "پریم ساگر" لکھی اور سب کچھ بدل ڈالا، کیوں کہ اس نے جو طریقہ اختیار کیا وہ یہ تھا کہ عروج اور مقبولِ عام زبان اُردو (جس کی بنیاد کھڑی بولی پر قائم ہے) میں سے عربی و فارسی زبان کے الفاظ کو نکال کر ان کی جگہ پر سنسکرت کے الفاظ رکھ دیے۔ فورٹ ولیم کالج کے احاطے میں مصنوعی طریقے سے گھڑی گئی۔ یہی زبان کھڑی بولی ہندی یا "اعلیٰ ہندی" کہلائی۔ کھڑی بولی ہندی میں انیسویں صدی سے قبل کے تحریری نمونوں کا فقدان ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں کھڑی بولی ہندی بنا تو لی گئی لیکن ۱۸۵۷ء تک اس کی طرف ہندوؤں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی اور بلا تفریق مذہب و ملت شمالی ہند کی عام زبان اُردو ہی رہی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کے تحت اس نوزائیدہ زبان (کھڑی بولی ہندی) کو بڑھاوا دیا۔ دھیرے دھیرے یہ ہندوؤں میں مقبول ہوتی گئی۔ اسے ہندو قومیت سے بھی جوڑ دیا گیا۔ جس کی غمازی "ہندی، ہندو، ہندوستان" کا نعرہ کرتا ہے۔ ان سب کے باوصف کھڑی بولی ہندی صرف نثر تک ہی محدود تھی۔ شاعری کے لیے اس کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ جدید ہندی کے معمار بھارتیندو ہریش چندر تک کھڑی بولی ہندی میں شاعری کے خلاف تھے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ اگر کھڑی بولی ہندی میں شاعری کی گئی تو وہ اُردو ہی بن جائے گی۔ کھڑی بولی سے ہندوؤں کی بے اعتنائی کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اسے نووارد مسلمانوں نے بہت پہلے اُردو کے لیے اپنا لیا تھا اور اسے "ہندی"، "ہندوی" اور "ریختہ" کہہ کر پکارنے لگے تھے۔

پھر یہی زبان، "زبانِ اردوئے معلّٰی"، "زبانِ اُردو" اور سب سے بعد میں "اُردو" کہلائی تھی۔ اُردو کو اسی لیے ہندی پر زمانی تقدم حاصل ہے اور ہندی، ہندوی اور ریختہ وہی زبان ہے۔ جس کا نام بعد میں اُردو پڑا۔ اس میں شعری نمونے امیر خسرو (۱۲۵۳ تا ۱۳۲۵ء) کے عہد سے ملنا شروع ہو جاتے ہیں، جب کہ کھڑی بولی ہندی میں شاعری کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ اس زبان میں شاعری کا آغاز بیسویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے۔

اُردو ایک ہند آریائی زبان ہے۔ شمالی ہندوستان میں ہند آریائی زبانوں کے آغاز کا سلسلہ ۱۵۰۰ قبلِ مسیح میں آریوں کے داخلۂ ہند سے شروع ہوتا ہے اور سب سے پہلے جس زبان کا ارتقاء عمل میں آتا ہے وہ سنسکرت کہلاتی ہے۔ سنسکرت زبان ایک ہزار سال تک پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہے پھر اس کے بطن سے ۵۰۰ ق م میں پرا

کرتمیں پیدا ہوتی ہیں، پھر پراکرتیں بھی مردہ ہو جاتی ہیں ۱۰۰۰ سنہ عیسوی تک پہنچتے پہنچتے اَپ بھرنشوں کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے اور ان کے بطن سے جدید ہند آریائی زبانیں اور بولیاں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ کھڑی بولی بولیوں میں سے ایک ہے جسے نو وارد مسلمانوں نے اپنایا نکھارا سنوارا اور ہندی، ہندوی، ریختہ کہہ کر پکارا۔ یہی زبان بعد میں اُردو کہلائی اور اسی کی بنیاد پر زمانہ حال کی کھڑی بولی ہندی ڈھالی گئی۔

مرزا خلیل احمد بیگ
(Street # 1 386, Iqra Colony, New Sir Syed Nagar Aligarh (U.P.) India)

ادار یے میں آپ نے تخلیق فن اور اس کی ترسیل اور ابلاغ کے لیے شعور کو کلیدی اہمیت دی ہے۔ ادب زندگی کی ایک صحت مند سرگرمی ہے۔ جس میں تخلیق کار، تخلیق اور قاری کی تثلیث تینوں کی شرکت ضروری ہے۔ اس مثلث کا تیسرا زاویہ ابلاغ کا متقاضی ہے۔ اس زاویے کو بہر کیف اہمیت دی جانی چاہیے۔ حنیف فوق، حسین الحق، فاطمہ حسن اور ارمان نجمی کی تحریریں زیادہ پسند آئیں شاید اس لیے کہ یہ ابلاغ کی دولت سے مالا مال تحریریں ہیں۔

شبیر احمد قادری
(Department of Urdu, Government College University, Faisalabad)

”تحزن“ کا شمارہ ۷ ارسال خدمت ہے۔ آپ سے گذارش ہے وقت نکال کر اس پر نظر ڈالیے۔ اچھی یا بُری رائے قائم کیجیے اور ہمیں اپنے جذبات و خیالات سے مطلع کر کے ممنون کیجیے۔ رسالے کی وصولی کی اطلاع ملتی ہے تو خوشی ہوتی ہے ورنہ یہ دھڑکا لگا رہتا ہے پرچہ آپ تک پہنچا بھی یا نہیں۔ آپ کی رائے اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم آپ کی رائے کا احترام کرتے ہیں کیونکہ اس کی روشنی میں آئندہ کام سنوارا جا سکتا ہے۔

مقصود الٰہی شیخ
(24 Park Hill Drive, Brad ford, Bd8 ODF West Yorkshire (U.K.)

ہندوستانی ادب نمبر کی ایک کاپی تازہ شمارہ کے ساتھ ارسال کریں گے۔ ایک صاحب جن کی تخلیق اس شمارے میں شامل ہے انہیں متعلقہ شمارہ نہیں مل سکا۔ پرولیا (مغربی بنگال) سے عمران قریشی نے اشاعت کے لیے مضمون ارسال کیا ہے۔ عشرت بیتاب صاحب آسنول کا ایک افسانہ آپ کے یہاں اشاعت کے لیے ہے۔

مغربی بنگال سے بایاں محاذ اور کانگریس کی حمایت سے روزنامہ ”آزاد ہند“ (کلکتہ) کے مدیر احمد سعید ملیح آبادی ایم۔ پی کی حیثیت سے ایوان بالا (راجیہ سبھا) کے لیے منتخب ہوئے ہیں۔ اُردو صحافت اور ادبی حلقوں میں خوشی کا ماحول ہے۔

نجم عثمانی
(New Colony, Wasseypur, Dhanbad Jharkhand)

خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں۔ ایک زمانہ تھا جب آپ ''آئندہ'' برابر بھجوایا کرتے تھے۔ اب علی امام کے نام ارسال کردہ ''آئندہ'' پڑھا کرتا ہوں کچھ نظمیں اور غزلیں بھجوا رہا ہوں۔ پسند آئیں تو رسالہ میں شائع فرمائیں۔ ہو سکے تو ''آئندہ'' الگ سے بھجوائیے کہ باقر مہدی مرحوم کا ادبی وارث بقول عنایت اختر، میں ہی تو ہوں۔

''باقیات باقر مہدی'' زیر طباعت ہے۔ آج یا کل تک ایک آدھ کاپی مل سکی تو علی امام کے ہاتھ بھجوا دوں گا۔

یعقوب راہی
(101 Arpan Apartment Luxmi Park, Nayanagar, Meera Road Mumbai : 401 107 M = 9820381737)

''ہندوستانی ادب نمبر'' میں میری مطبوعہ نظموں کا شکریہ بھی ابھی مجھ پر واجب ہے۔
غزلیں معیار پر پوری اتریں تو قریبی اشاعت میں شامل کر لیجیے گا۔

مرغوب علی
(49 Dharm Daas Najeb Abad : 246763 (U.P.) India)

دو عدد غیر مطبوعہ غزلوں کی سوغات لے کر بزم ''آئندہ'' میں پہلی بار شرکت کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں۔ پسند خاطر ہوں تو کسی بھی اشاعت میں شامل کر لیں۔

امین اشرف
(Gul-e-Simnan 4/54, Badar Bagh Aligarh : 202002 (U.P.))

بہت عرصے بعد آپ سے رابطہ کر رہی ہوں مگر ''آئندہ'' باقاعدگی سے مجھے مل رہا ہے اور میں اس سے مستفید ہو رہی ہوں۔ آپ کے حکم پر چند نظمیں اور غزلیات بھیج رہی ہوں۔ افسانے کا حکم انشاء اللہ آئندہ ماہ پورا کروں گی۔ آپ کا رسالہ ہمیشہ کی طرح انتہائی سلیقے اور باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے اس میں آپ کی مستقل مزاجی اور ادب نوازی کا دخل ہے انشاء اللہ جولائی کے دوسرے ہفتے تک کراچی آؤں گی تو آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہو سکے گا۔

تسنیم عابدی
(Post Box # 2035 Abudhabi (U.A.E.) Ph # 6607060-6608791)

سابق کی طرح یہ پرچہ بھی اپنی شمولات کے لحاظ سے بے حد جاندار ہے۔ مضامین میں جناب حنیف فوق صاحب، نجم الدین احمد صاحب اور فاطمہ حسن صاحبہ کی نگارشات پسند خاطر ہیں۔ برادر عزیز ارمان نجمی کے دلائل بہت زوردار ہے۔
نظموں میں عین سلام، وحید الحسن امجد اسلام امجد، یعقوب تصور اور صبا اکرام کی نظمیں میرے احساس کو چھو

گئیں۔اقبال فریدی، غلام حسین ساجد، صابر ظفر، عبداللہ حد ساز کی غزلیں مجھے پسند آئیں۔شمی فارو قی کے گیتوں نے من کو موہ لیا۔

اپنے عزیز بھائی شفیق کا افسانہ میں پہلے بھی نہیں پڑھ چکا ہوں؟ شاید اسے تیسری مرتبہ پڑھ رہا ہوں۔وہ تو جلد جلد لکھنے پر قادر ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ایک ہی افسانہ بار بار اشاعت کے لیے بھجوار ہے ہیں،ان کے نئے افسانہ کا مطالبہ کرنے کا مجھے حق ہے اور میں اسے استعمال کرتا ہوں۔

کرشن کمار طور

(Dharamshala : 1762 (U.P.) India)

دو تخ یں دوستوں کی بھجوار ہا ہوں۔اُمید ہے ''آئندہ'' کے لیے پسند خاطر ہوں گی۔

شمس الرحمٰن فاروقی

(29-C Hastings Road, Allahabad : 211001 (U.P.) India)

''آئندہ'' کا شمارہ نمبر ۴۹ شاہین نظر صاحب سے لے کر پڑھا۔''آئندہ'' کا معیار ہمیشہ ہی متاثر کرتا ہے۔اس شمارے میں بھی سجاد ظہیر، پریم چند اور مشفق خواجہ سے متعلق مضامین بہت خوب ہیں۔منظومات اور غزلیات کا حصہ بھی دلچسپ ہے۔اور سب سے بڑھ کر اداریہ بس میں مختصر اً مگر جامع طور پر آپ اپنی بات کے ابلاغ میں کامیاب رہتے ہیں۔

قیوم واثق

(B-189, Khudadad Colony, Zone 7, Karachi : 5 Cell # 0300-2155844)

بعض مصروفیات کے باعث تاخیر سے ملاقات کی گنجائش نکال پا رہا ہوں۔ایسے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ میں ''آئندہ'' کے شمارے دستیاب بھی ہو جاتے ہیں۔آپ پابندی کے ساتھ رسالہ جاری رکھے ہوئے ہیں جو کہ بہت بڑی بازیافت ہے اور ہمارے خوش آئند بات بھی۔غزلیں حاضر ہیں۔

عادل حیات

37/89, Woodside Apartment, Ghaffar Manzil, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

ایک افسانہ ''آنگن کی اداسی'' اور ایک مضمون ''اعزاز افضل، شخصیت اور فن'' پیشِ خدمت ہے۔

عشرت بیتاب

("Zeb Kadah" Jahangiri Mohalla Asansol - 713302 Ph # 0341-2209846)

❁❁